تاریخِ اسلام کے

چند زرّیں واقعات

مصنّف

ڈاکٹر عبداللطیف

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ - لاہور

نگرانِ تدوین و طباعت: مسعود صدیقی
ایڈیٹر، پنجاب ٹیکسٹ بک

طابع: ——— ایم ظہیر الدین

مطبع: ——— استقلال پریس

ناشر: ——— پنجاب ٹیکسٹ بک
لاہور

تاریخ اسلام کے چند زریں واقعات

۱ - ہجرت
۲ - فتح مکہ
۳ - فتح شام۔ جنگ یرموک
۴ - فتح ایران - فتح الفتوح
۵ - سانحۂ کربلا
۶ - فتح اندلس (سپین)
۷ - فتح قسطنطنیہ
۸ - قرارداد لاہور - استقلال پاکستان
۹ - پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء

وارثانِ نشانِ حیدر	کشمیر	مشرقی پاکستان
	کیپٹن سرور شہید	میجر طفیل محمد شہید
	میجر راجہ عزیز بھٹی شہید	راشد منہاس شہید
	محاذ لاہور	نزد ٹھٹھہ سندھ

ہجرت

بچو! حضور نبی کریمؐ نے مکہ کی سرزمین پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور فرمایا۔ "اے مکہ کی سرزمین تو مجھے کتنی عزیز ہے لیکن افسوس کہ تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔" حضور پاک کے ان چند الفاظ میں شہر مکہ سے محبت اور اہلِ مکہ کے ظلم و ستم کی کتنی ہی داستانیں پوشیدہ ہیں۔

در اصل بات یوں ہوئی کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر قریش مکہ نے آنحضرت کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ وہی لوگ جو کل تک آپ کو "امین" اور "سچا" کہتے تھے اور حضور پاک کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے، اسلام کا نام سنتے ہی آج آپ کے خون

کے پیاسے ہوگئے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگے۔ اینٹ، پتھر اور روڑے مارتے گالیاں دیتے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، ان کا ظلم وستم بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت بلالؓ جن کا نام تاریخِ اسلام میں عاشقِ رسول کی حیثیت سے مشہور ہے ایک حبشی غلام تھے انھیں اسلام اور حضور سے سچّی محبت تھی۔ ان کا مالک ایک کافر تھا۔ بڑا ہی ظالم اور سنگدل انسان تھا۔ وہ انھیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر پتھر کی گرم سِل اُن کے سینے پر رکھ دیتا اور جب پھر بھی وہ خدا و رسول کا نام لینے سے باز نہ آتے تو گلے میں رسی ڈال کر شریر لڑکوں کے حوالے کر دیتا جو انھیں گلی کوچوں میں لیے پھرتے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے ماں اور باپ کو قریش نے اپنے ظلم وستم کا اس بے رحمی سے نشانہ بنایا کہ وہ بیچارے ان کی سختیوں کی تاب نہ لا کر شہید ہوگئے۔ پھر حضرت عمار کی اپنی باری آئی تو ان کو بھی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں گرم ریت پر لٹا کر خوب پیٹتے۔

مسلمان تعداد میں بہت تھوڑے تھے۔ لونڈی
غلام اور غریبوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد قریش
کے حوصلے بڑھ گئے اور اب وہ آزاد اور عزت دار
آدمیوں پر بھی ہاتھ اٹھانے لگے۔ جہاں کہیں موقع ملتا
انھیں دکھ دیتے اور ستاتے رہتے۔ بیچارے مسلمانوں پر
جب عرصۂ حیات یوں تنگ ہوا تو اُن کی نگاہیں یثرب
کی طرف اٹھ گئیں، جہاں اسلام کی روشنی تیزی سے پھیل
رہی تھی۔

یثرب جسے آج کل مدینہ منورہ کے نام سے یاد کیا
جاتا ہے، مکّہ سے کوئی دو سو میل شمال کی طرف واقع ہے۔
مدینہ کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ
ہے جن کے ساتھ ہری بھری کھیتیاں نظر آتی ہیں۔ وادی
کے اندر کھجوروں کے اونچے نیچے درختوں کی قطاریں ایک
عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ ان سے ذرا آگے بڑھیے تو
حضور سرورِ کائنات کے روضۂ مبارک کا سبز گنبد
دکھائی دیتا ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل
کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ ادب گاہ ہے، جہاں

کی لڑی میں پروئے جائیں تو یقین کریں وہ لوگ آپ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھیں گے۔" لوٹ کر یثرب پہنچے تو اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو سنایا تو ان سب کو بھی ایسا دین قبول کرنے کے لیے بخوشی آمادہ پایا، جس سے اتحاد اور نفاق کی بنیادیں استوار ہوں اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب ان دونوں قبیلوں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں حضور سرورِ کائنات کے تذکرے نہ ہوں۔

اگلے سال حج کا موسم آیا تو اب کی بار یثرب سے بارہ آدمی مکہ پہنچ کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا اور ساتھ ہی حضور سے درخواست کی کہ ہمارے ہاں کسی ایسے آدمی کو بھیجا جائے جو یثرب میں جاکر عوام کو اسلام کا مطلب سمجھائے۔ حضور نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ بھیجا۔ جن کی تبلیغ سے بہت سے آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے اور یوں یثرب کی پاک و پاکیزہ سرزمین میں اسلام کا پودا پروان چڑھنے لگا۔

اس واقعے کو ایک سال کی مدت بیت گئی اور پھر

زیارت مکہ کے دن آئے۔ بہتر (۷۲) مرد اور عورتوں نے مکہ آکر رسولِ خدا کے ہاتھ پر بیعت کی اور بڑے اصرار کے ساتھ عرض کی کہ آپ ہمارے شہر میں تشریف لے آئیں۔ ادھر معصب بن عمیرؓ نے بھی اطلاع دی تھی کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی ساکھ بھی ترقی پر ہے۔ مکہ کی طرح یہاں کسی قسم کی سختی یا ظلم نہیں ہوتا۔ پانی کی بھی قلت نہیں۔ وسائل زندگی کی فراوانی ہے۔ کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ باغات بھی ہیں۔ اب ان لوگوں نے جب بڑے ادب اور زور سے گذارش کی تو حضور رحمتِ عالم نے سوچا کہ کیوں نہ اہلِ یثرب کی دعوت کو قبول کر لیا جائے. یہ بھی غیبی امداد ہے۔

اب رسولِ پاک نے مکہ والوں کی ایذا رسانی کے اندیشہ سے مسلمانوں کو اِکا دُکا ہجرت کی اجازت بخش دی. توحید میں سرشار مسلمانوں نے بھی گھر بار کی پروا نہ کی۔ اپنا سب کچھ وہیں چھوڑا اور صرف ایمان کی دولت ساتھ لے کر مدینہ کا رُخ کیا۔ مدینہ کے انصار نے بھی خوب

خاطر مدارات کی اور ایسی کشادہ دلی، پیار، محبت اور اخوت کا ثبوت دیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ان کے حسنِ سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ سارے مسلمان مکہ سے نکل کر مدینہ جا پہنچے جو ان بیچاروں کے لیے دار السلام ثابت ہوا۔ رسولِ پاکؐ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ باقی رہ گئے۔ ایک دن حضرت ابوبکرؓ نے بھی ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا "ابھی جلدی نہ کریں۔ شاید خدا آپ کے لئے کوئی رفیق سفر پیدا کر دے" حضور خدا کے حکم کے منتظر تھے اور یہ دونوں حضور کے حکم کے پابند۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قریش کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو قسمت یاوری کرے اور مسلمان اقبال مند ہو جائیں اور پھر وہ ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔ قریش کا خیال تھا کہ اگر حضورؐ بھی مدینہ چلے گئے تو حالات خطرناک صورت اختیار کریں گے۔ وہ خیر و برکت کے اس سرچشمے کو ہمیشہ کے

لیے بند کر دینا چاہتے تھے مگر قبائل کی باہمی جنگ سے بہت ڈرتے تھے۔ آخر ایک مجلس مشاورت قائم کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک شخص منتخب کر کے سب کے سب یک بار حضور پاک پر ٹوٹ پڑیں اور یوں جب سب کی تلواریں حضور کے خون پاک سے رنگین ہوں گی تو ہاشمی دم نہ مار سکیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ سب حضور کے آستانۂ مبارک کے باہر گھات میں بیٹھ گئے۔

حضرت علیؓ کی جاں نثاری

اتنے میں رسولِ پاک کو بھی اللہ کی طرف سے مدینہ جانے کا حکم آگیا۔ آپ کے پاس بہت سے لوگوں کی امانتیں تھیں، وہ آپ نے حضرت علیؓ کے حوالے کیں اور فرمایا "ہم آج اللہ کے حکم سے ہجرت کر رہے ہیں۔ میرے بستر پر سو رہنا اور اگلے دن یہ امانتیں لوگوں کو پہنچانے کے بعد مدینہ چلے آنا۔" ادھر گھات میں چھپے ہوئے دشمن آکر دیکھ جاتے کہ بستر پر کوئی محوِ خواب ہے اور مطمئن ہو جاتے۔ جب رات

ڈھل گئی تو حضور پاکؐ ان کے بیچ میں سے نکل کر چلے گئے اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔ اور حضرت ابوبکرؓ کو ہمراہ لے کر جنوب کی سمت "غارِ ثور" کا رُخ کیا۔ یہ مکہ سے تین میل دُور ہے۔ وہاں غار میں چھپ رہے۔ پچھلے پہر جب پو پھٹنے میں تھوڑی دیر رہ گئی تو دشمن مکان کے اندر گھس آتے اور آپ کی جگہ حضرت علیؓ کو موجود پایا تو سناٹے میں آ گئے۔ ہر طرف آپ کی تلاش میں سوار دوڑاتے اور اعلان کیا کہ جو شخص حضور کا سرِ مبارک لائے گا سو اونٹ انعام پائے گا۔ اس انعام کے لالچ میں سینکڑوں شتر اور گھوڑ سواروں نے صحرا کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ان میں سے بعض "غارِ ثور" کے منہ تک بھی جا پہنچے۔ ان کی آوازیں غار کے اندر سنائی دیں تو حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے، مگر حضور پاک نے بڑے اطمینان سے تسلی دیتے ہوئے فرمایا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" جب وہ لوگ واپس لوٹے تو ان کے ساتھیوں نے پوچھا کہ غار کے اندر کیوں نہ گئے۔ انھوں نے کہا اندر جانے کی حاجت نہ تھی۔ غار کے منہ پہ تو مکڑی

کا جالا تھا اور دو جنگلی کبوتروں نے گھونسلہ بنا کر انڈے دیئے ہوئے تھے۔ وہاں تو مدتوں سے کسی کا قدم اندر نہ گیا ہو گا۔

سرور عالمؐ اور حضرت ابوبکر پورے تین دن اور تین راتیں غارِ ثور میں چھپے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رات کے وقت چوری چھپے آتے اور دشمنوں کے منصوبوں سے آگاہ کر جاتے اور ان کا نوکر صبح و شام بکریوں کو چراتا ہوا ادھر آ جاتا اور بکریوں کا دودھ پلا جاتا۔ حضورؐ ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ چوتھے روز جب یقین ہو گیا کہ اب قریش کے انتقام کی آگ پر اوس پڑ چکی ہے تو باہر نکلے۔ دو اونٹنیاں ان کے لئے منتظر تھیں جو حضرت ابوبکرؓ نے اسی مبارک دن کے لئے پال رکھی تھیں۔

ایک اور معجزہ جھلسا دینے والی دھوپ اور تپتے ہوئے صحراء میں راستے کی بلندیوں اور پستیوں سے گزرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ذرا ستانے کے لیے رُکے۔ دوبارہ سوار

ہونے کو تھے کہ پیچھے سے دشمنوں کا ایک آدمی جس کا نام سُراقہ تھا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ سُراقہ کو یقین تھا کہ اب سو اونٹ کا انعام اُسی کا ہے۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سوار دھڑام سے نیچے آرہا۔ پھر اٹھا اور پھر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا مگر پھر وہی کچھ ہوا۔ وہ اٹھا سنبھلا اور ترکش سے تیر نکال کر فال لی۔ جواب نفی میں تھا۔ سمجھ گیا کہ شگون اچھا نہیں۔ نہایت عاجزی سے سرکارِ دو عالمؐ کو آواز دی اور امان کی تحریر مانگی۔ سراقہ واپس چلا گیا اور جو لوگ آنحضرت کے تعاقب میں تھے انھیں واپس لوٹاتا گیا کہ حضورؐ ادھر سے نہیں گزرے۔ مدینہ کے یہ مقدس مسافر اب قدرے اطمینان کے ساتھ اس بے سرو سامانی میں اپنی منزل کی طرف بڑھتے گئے۔ اور منزل بمنزل سفر طے کرکے مدینہ کی ایک نواحی بستی "قبا" میں جا پہنچے۔ یہ بستی مدینہ سے صرف تین میل دُور ہے۔ یہاں آپ نے کچھ روز قیام فرمایا۔ یہیں حضرت علیؓ بھی اُن سے آملے۔ وہاں ایک مسجد

کی بنیاد ڈالی۔ اس مسجد کے بنانے میں بڑے بڑے صحابہ شریک ہوئے۔کوئی گارا لاتا، کوئی لکڑیاں چیرتا، کوئی پتھر ڈھوتا۔خود رسول پاکؐ بڑے بڑے بھاری پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ دو ہفتے کے قیام کے بعد رسول خدا نے آخر مدینہ کا رُخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک اک شہر بسا ہوا تھا۔ انصار کا جوشِ مسرت قابلِ دید تھا لوگ راستوں کے دونوں طرف صفیں باندھے کھڑے تھے۔ حیا سے جھکی ہوئی آنکھوں والی بیبیاں گھروں کی چھتوں پر کھڑی تھیں۔ بچے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ننھی ننھی بچیاں دَف بجا کر آپ کی تعریف میں گیت گا رہی تھیں۔ رسول پاک جوشِ عقیدت کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے گزرتے ہوئے محلہ "بنی سالم" میں پہنچے۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ وہیں ادا کی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ رسولِ پاکؐ اس کے ہاں ٹھہریں۔ لوگ راستے میں جابجا اونٹ کی مہار تھام کر عرض کرتے۔ مگر آپ نے فرمایا "اونٹ چھوڑ دو جہاں یہ میرے خدا کے حکم سے رکے گا وہیں ہم اتر پڑیں گے۔"

اونٹ حضرت ایوب انصاریؓ کے مکان کے پاس ایک میدان میں پہنچ کر رک گیا۔ آپ نے وہ جگہ خرید لی اور وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور خود حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں جا ٹھہرے۔ حضور کی میزبانی کا شرف انہی کو حاصل ہوا اور

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

مکہ سے مدینہ کی ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ میں اِک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اسلامی سِن ہجری اسی سال سے شروع ہوتا ہے۔

فتح مکہ

ہجرت کے بعد مسلمانوں کو اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ خدا نے انھیں ہر میدان میں فتح و نصرت عطا کی ۔ اسلام اب گرد و نواح میں بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا مسلمانوں کو مدینہ میں رہتے ہوئے کئی سال گذر گئے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ مدینہ کی سر زمین نسبتاً زیادہ سرسبز و شاداب تھی لیکن وطن خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو ہر کسی کو پیارہ ہوتا ہے۔ حب الوطنی کے لئے شادابی شرط نہیں ہوا کرتی ۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کے دلوں میں مکہ کی یاد چٹکیاں لینے لگی ۔ وہ چاہتے تھے کہ بن پڑے تو اڑ کر مکہ پہنچ جائیں ۔ حج کے دن آتے تو یہ یاد بہت تازہ ہو جاتی، حتیٰ کہ حضرت بلالؓ جن پر قریش مکہ نے مکہ

کی زمین تنگ کر دی تھی، وہ بھی مدینہ میں بیٹھ کر بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے " آہ کیا پھر کبھی وہ دن آ سکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں ایک رات بسر کروں۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ اضطراب اور یہ بے چینی بھی اللہ ہی کی طرف سے تھی۔ شاید قدرت مسلمانوں پر فتح و نصرت کے نئے دروازے کھولنا چاہتی تھی۔

صلح حدیبیہؓ ہوئی تو معاہدہ میں یہ طے پایا کہ جو لوگ نبی کریمؐ سے عہد کرنا چاہیں انھیں آزادی ہے اور جو لوگ یا قبائل قریش سے قول و اقرار کرنا چاہیں انھیں بھی آزادی ہے۔ چنانچہ عرب کے دو قبیلوں بنی خزاعہ اور بنی بکر نے اپنی پرانی دشمنی کی بناء پر علیحدہ علیحدہ معاہدے کیے۔ پہلے قبیلے نے مسلمانوں سے عہد کیا اور دوسرے نے قریش کے ساتھ معاہدہ کیا۔

صلح حدیبیہ کو دو سال گزرے تو ان قبیلوں میں جھگڑا ہو گیا۔ قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے دوست قبیلے کا ساتھ دیا اور دوسرے

قبیلے پر بڑے ظلم و ستم کیے۔ ان کے بہت سے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو بچے انھوں نے بھاگ کر کعبہ میں پناہ لی اور قریش سے انصاف کی درخواست کی۔ قریش نے ان کی بات پر مطلق کان نہ دھرا۔ اب انھوں نے مدینہ منورہ حاضر ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خدائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دہائی دی۔ آنحضرتؐ نے ان شکستہ دل مظلوموں کی دردناک داستان بڑے اطمینان سے سُنی۔ سُن کر آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ تاہم ہمارے امن پسند آقا نے قریش کو کہلا بھیجا کہ ہمارے ساتھیوں کا جو نقصان ہوا ہے، یا تو خون بہا ادا کر کے وہ پورا کر دو یا پھر ظالموں کی حمایت کرنا ترک کر دو اور یہ دونوں شرطیں منظور نہیں تو اعلان کر دو کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ قریش فطرۃً بہادر تھے اور بہادر خطرے کو خاطر میں نہیں لایا کرتے، انھوں نے غصہ میں آ کر کہہ دیا کہ جاؤ جا کر کہہ دو کہ معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔

کہنے کو تو کہہ دیا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔

لیکن بعد میں جب غصے کا بھوت سر سے اُترا تو بہت
پچھتائے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام اب ایک طاقت
بن چکا ہے۔ اب اسلام کو ان سے نہیں بلکہ خود
قریش کو مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ اب ابو سفیان خود
مدینہ پہنچا تاکہ جیسے بھی بن پڑے صلح حدیبیہ کو
پھر سے زندہ کیا جائے۔ مگر وہاں دشمن دین کو کسی
نے بھی منہ نہ لگایا۔ بڑے بڑے صحابیوں کی منت
سماجت کی کہ رحمتِ عالمؐ سے کہہ سن کر معاہدے کی
تجدید کرا دیں مگر سب نے معذوری ظاہر کی۔ پانی
سر سے گذر چکا تھا۔

ہجرت کا آٹھواں سال اور رمضان کی دسویں
تاریخ تھی۔ حضور سرور کائنات دس ہزار جاں نثاروں
کے ساتھ فاران کی مقدس پہاڑیوں پر جلوہ گر ہونے
کے لئے آگے بڑھے۔ قریش بے خبر تھے کہ مسلمان
مکہ سے ایک منزل پر جا پہنچے۔ فوج نے دور
دور تک ڈیرے ڈال دیئے۔ جگہ جگہ آگ روشن کر
دی گئی۔ ابو سفیان بھی سائے کی طرح ساتھ چمٹا

ت تھا۔ عرب کے اُس دُرِّ یتیم کے جلال کو دیکھ کر
ہ سناٹے میں آگیا۔ اتنے میں حضرتِ عمرؓ نے
سے دیکھ لیا۔ قریب تھا کہ اُس کی گردن اڑا
یں۔ مگر حضرتِ عباسؓ نے بیچ بچاؤ کیا اور یوں
بو سفیان کو دربارِ رسالت میں لے گئے۔ وہ کونسا
ظلم تھا جو ابوسفیان نے مسلمانوں پر نہ کیا تھا۔ مکہ
سے نکالا، مدینے میں ان پر حملے کیے۔ جنگیں لڑیں۔
بائل کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا۔ اسلام کو مٹانے
یں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم تو ساری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے
تھے۔ وہ دشمنِ دین صورتِ سوال بن کر سامنے آیا تو
سے بھی معاف کر دیا ؎

ما برائے وصل کردن آمدیم
نے برائے فصل کردن آمدیم

مسلمانوں کی تلواریں میان میں چلی گئیں اور حاضرین کے
تھے کی شکنیں دُور ہوگئیں۔

صبح دم سور نکلا ہی تھا کہ اسلامی جھنڈا ہوا

بس لہرایا اور ہتھیاروں میں ڈوبی ہوئی اللہ کی
فوج آگے بڑھی۔ سب سے پیچھے حضور پُرنور کی
سواری تھی۔ قریش یہ خبر سُن کر سہمے ہوئے تھے
مقابلے کی کس میں ہمت تھی۔ ہاں کچھ جوشیلے او
من چلے نوجوانوں نے ایک جگہ مسلمانوں کو روکا او
دو صحابیوں کو شہید بھی کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں
تلواریں سونت لیں تو ایک درجن لاشیں چھوڑ کر ف
ہو گئے۔ اس معمولی سی مڈھ بھیڑ کے سوا کسی کی نکی
تک نہ پھوٹی۔ 29027

فاتح لوگ فتح کے بعد جب شہروں میں داخ
ہوتے ہیں تو اپنے جلال کا نظارہ دکھاتے ہیں۔ لیکن
ادھر حضور اپنے رب کے احسان کے بوجھ تلے گر
جھکائے چلے جا رہے تھے۔ وہ خود دوسروں کے
دلوں سے خوف دور کرنے آئے تھے۔ بھلا وہ دن
کو کیوں ڈرائیں۔ ایک بڑھیا کو دیکھا کہ سہمی جا ر
ہے۔ اونٹ سے اُتر کر فرمایا، مجھ سے خوف نہ کھ
میں اس عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کر

تھی۔ آنحضرت سورۂ فتح تلاوت کرتے ہوئے خانۂ
کعبہ میں داخل ہوئے، جہاں بتوں کی خدائی تھی۔ رسول
اللہ نے اُن بتوں سے کعبہ کو پاک کیا اور دیواروں
پر بنی ہوئی تصویروں کو مٹا دیا۔ اس کے بعد حضور نے
اندر جا کر نماز پڑھی اور مکہ کی فضا تکبیر کے نعروں
میں بس گئی۔ نماز پڑھ کر خطبہ دیا۔ اس کے بعد اردگرد
دیکھا۔ سامنے وہی پرانے خون کے پیاسے لوگ سر
جھکاتے کھڑے تھے۔ رحمت عالم ان سے مخاطب ہوئے۔
وہ سہمے کھڑے تھے کہ دیکھیں آج کیا ہوتا ہے سب
آ چکے تو فرمایا:۔

"اللہ ایک ہے۔ اُس کے سوا کوئی عبادت کے
لائق نہیں۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اُس نے مسلمانوں
کی مدد کی اور تمھارے غرور کا سر نیچا کر دکھایا۔"
پھر پوچھا "تم جانتے ہو میں تم سے کیا سلوک کرنے
والا ہوں"۔ جس پر سب پکار اُٹھے کہ تو شریف بھائی
اور شریف برادر زادہ ہے۔ حضور کی آنکھوں میں آنسو
ڈبڈبا آئے۔ فرمایا "جاؤ، آج تمھارے سب قصور معاف

کر دیے گئے۔ تم پر کوئی الزام نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔"
کہو بچو! تم نے دنیا کی تاریخ میں کبھی ایسے فاتح کا حال پڑھا ہے جو اپنے دشمنوں کی حالتِ زار پر خود رونے لگے۔ عفوِ عام کے اس روح پرور نظارے کو دیکھ کر لوگ پھڑک اٹھے۔ ڈرے دبکے، بھاگے اور دوڑے ہوئے قریش واپس آ گئے۔ اس حلم اور اس رحمدلی نے اہلِ مکہ کے دل موہ لئے۔ وہ خودبخود اسلام کی جانب مائل ہوئے۔ آپ کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر گئی اور یوں توحید کا نور گھر گھر پھیل گیا۔ سب نے حق و صداقت کی راہ اختیار کی۔ اس سے بیس برس پہلے حضور نے کوہِ صفا پر چڑھ کر جو پیشگوئی کی تھی وہ آج پوری ہو گئی۔

جنگ یرموک (فتح شام)

سارے اسلامی مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ حضورؐ نے ۶ھ کے آخر یا ۷ھ کے شروع میں بیک وقت ایران کے خسرو پرویز، روم کے قیصر ہرقل، مصر کے حاکم اور حبشہ کے نجاشی کو اسلام کی دعوت دی تھی۔

ہرقل کے دربار میں اسلام کی آواز اِک بڑی اجنبی سی آواز تھی۔ وہ اپنے وقت کی بہت بڑی بڑی طاقتوں کو نیچا دکھا چکا تھا۔ اس کی عظیم فتوحات نے انسانی تاریخ کا رُخ بدل دیا تھا۔

جب ہرقل کے حکم سے بھرے دربار میں وہ خط پڑھا گیا اور سلطنت روم کے امراء اور کلیسا۔ کے پیشواؤں کو برداشت کی طاقت نہ رہی۔ ہر طرف

سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ہرقل نے اپنی رعایا کا اضطراب دُور کرنے کے لئے عربوں کو دربار سے نکال دیا۔ کلیسا کے محافظوں نے اسے مبارک بادیں دیں۔ یہ محض وقتی خوشی تھی۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ عرب کے صحرا سے جو سیلاب امڈا ہے، وہ ان سب کو تنکے کی طرح بہا لے جائے گا۔ یثرب کی طرف سے اٹھنے والی رحمت کی گھٹاؤں کو برسنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔

عرب سے آنے والے یہودی اپنی انتقام کی آگ کو بجھانے کے لئے رومیوں کو مقابلے کے لئے اُکسا رہے تھے۔ ادھر شام کے رومی حاکموں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے کے لئے وہ غسانی رئیس بھی سخت بیتاب تھے جنھیں اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ اپنی سرحدوں سے زیادہ قریب دکھائی دیتا تھا۔ مذہباً یہ لوگ عیسائی تھے اور وہ اپنے رومی حاکموں کو بغیر کسی تاخیر کے صحرائے عرب پر چڑھائی کا مشورہ دے رہے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا دَورِ خلافت تھا۔ مسلمانوں نے

شام اور فلسطین میں پیغامِ حق سنانے کے لئے جب کوششیں شروع کیں تو ہرقل ان دنوں اپنے عین عروج پر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی چھوٹی موٹی فتوحات کی خبریں سنیں تو بہت سٹ پٹایا۔ وہ اپنے وقت کی بہت بڑی بڑی طاقتوں کو پامال کر چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پوری قوت اور طاقت سے کام لیکر مسلمانوں کے اس سیلاب کو آگے بڑھنے سے ہمیشہ کے لئے روک دے گا۔ چنانچہ جنگی تیاریوں کو تیز تر کرنے کے لئے وہ بنفسِ نفیس حمص کے شہر میں پہنچ گیا۔

اُس نے حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ مسلمانوں کا لشکر اُس وقت چار مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے اور وہ حضرت ابو عبیدہؓ ابن جراح، یزید بن ابی سفیانؓ عمرو بن العاصؓ اور شرجیل بن حَسَنَہؓ کی کمان میں مختلف محاذوں پر مصروفِ جنگ ہیں۔ ادھر حضرت خالد بن ولیدؓ عراق میں پیش قدمی کر رہے تھے۔

اسلامی لشکر کی یہ تقسیم ہرقل کے لئے بہت حوصلہ افزاء تھی۔ اُس نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ

مسلمانوں کے لشکر کو یکجا نہ ہونے دیا جائے بلکہ اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کے ان لشکروں سے الگ الگ نبٹ لیا جائے۔

ادھر مسلمانوں کو بھی ہرقل کی اس سکیم کا پتہ چل گیا۔ انھوں نے فوراً حضرت ابو بکرؓ کو اطلاع دی۔ انھوں نے تازہ ہدایات بھیجیں اور مشورہ دیا کہ جگہ جگہ منتشر ہونے کی بجائے سارے لشکر اکٹھے ہو جائیں۔ دشمن کے ٹڈی دل لشکر سے نبٹنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

ادھر خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں عراق کے اندر اسلامی فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں لیکن شام چونکہ حجاز سے قریب تر تھا اس لیے اس کے متعلق تشویش زیادہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو حکم دیا کہ فوراً شام کی طرف کوچ کر کے اسلامی فوجوں کو کمک پہنچائیں۔ عراق اور شام کی راہ میں لق و دق صحرا تھا۔ جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ حکم ملتے ہی حضرت خالدؓ نے زادِ راہ کا بندوبست کر کے صحرا کا خطرناک سفر

شروع کیا اور بگولے کی طرح آگے بڑھتے ہوئے صرف اٹھارہ دنوں میں شام جا پہنچے۔ حضرت خالدؓ فنونِ جنگ میں ماہر، دور اندیش اور بالغ نظر جرنیل تھے۔ آپ نے فوراً بھانپ لیا کہ جب تک سبھی کماندار ایک جھنڈے تلے جمع نہ ہو جائیں گے، فتح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ نے عرب کے تمام سرداروں اور فوجی امیروں کو اکٹھا کیا اور یوں مخاطب ہوئے۔

اے خدا کے سپاہیو! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سب خلیفہ کے حکم کے تحت مختلف مقامات اور محاذوں پر اسلامی فوجوں کی کمان کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عقل و ہوش سے کام لیں۔ ہم سب اللہ کے سپاہی ہیں جو اس کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے ہیں۔ ہمیں صرف اس کے نام کی سربلندی اور خوشنودی درکار ہے اور خدا رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آج سے بڑھ کر کوئی موقع نہیں۔ اپنی فوجوں کی مختصر تعداد کو دیکھو اور ادھر سامنے

دشمن کے ٹڈی دَل لشکر پر نگاہ ڈالو، جن کے پاس لا تعداد اسلحہ بھی ہے، یہ بڑا کٹھن وقت ہے۔ آج اپنے حسب یا عہدے پر فخر کرنے اور اترانے کا وقت نہیں۔ غیر کی سرزمین، دشمن کا ملک جو لاکھوں کی تعداد میں لاؤ لشکر لے کے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ذاتی شخصیتوں میں الجھنے کا دن نہیں۔ آؤ سارے یکجان ہوکر دشمن کا مقابلہ کریں۔ اسی میں اسلام کی سر بلندی ہے اور اسی میں ہماری سلامتی ہے۔ رہا معاملہ فوجوں کے سردار اور امیر کا۔ آؤ اسے تقسیم کرلیں۔ ہر روز باری باری ایک ایک آدمی امیر کے فرائض انجام دے۔ آج کے دن آپ مجھے امیر تسلیم کرلیں۔ کل کوئی اور سہی پھر دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔

حضرت خالدؓ کے ان الفاظ نے مسلمانوں کے دل ایمان کی حرارت سے گرما دیئے۔ سبھی نے ان کی صدا پر لبیک کہا اور یوں اسلامی لشکر دشمن سے مقابلہ کے لئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی

طرح ڈٹ گیا۔

رومیوں کی فوج لاکھوں میں تھی۔ اسلامی فوج تعداد میں بہت کم لیکن شوقِ شہادت میں سرمست تھی۔ ادھر عیسائی پادریوں نے سارے ملک میں گھوم گھوم کر لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور رومی دو لاکھ فوج لے کر بڑی سج دھج سے مقابلے کے لئے نکلے۔ حضرت خالد نے اپنی فوجی صلاحیت کا جو ثبوت اس دن دیا، اس کی نظیر تاریخِ عالم میں ملنی محال ہے۔ آپ نے اپنی فوج کو ہزار ہزار کے دستوں کی شکل میں تقسیم کیا اور ہر دستے کو ایک ماہر جنگ کی کمان میں دیا۔ ۲۰ ر اگست ۶۳۶ء کا دن اسلامی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے۔ اُس روز دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اس روز بلا کی گرمی تھی۔ ساتھ ہی آندھی بھی آگئی۔ مسلمانوں نے اسے بھی تائید ربانی سمجھا اور یوں جان توڑ کر لڑے کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بعض اسلامی دستوں کو سخت مقابلے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا لیکن بہادر مسلمان خواتین نے

پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں کو للکارا کہ یہ عربوں کا شیوہ نہیں۔ تم نے بڑے بڑے معرکوں کو سر کیا ہے۔ کیا آج تمہارا قدم پیچھے ہٹ جائے گا۔ اگر تم ہماری حفاظت نہ کرسکو گے تو تمہیں ہمارے سرپرست بننے کا کوئی حق نہیں۔ یہ الفاظ سپاہیوں کے دلوں میں تیروں کی طرح گڑ گئے اور لوٹ کر پھر رومیوں پہ پل پڑے۔ خود مسلم خواتین نے بے مثال ہمت، جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف رہیں۔ سپاہیوں کو تیروں کی بوچھاڑ میں پانی پلاتی رہیں۔ ادھر مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ حال تھا کہ شوقِ شہادت میں بے تاب تھے۔ علامہ اقبال نے ان کے شوقِ شہادت کا ایک واقعہ یوں منظوم کیا ہے کہ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں عرض کی کہ اے امیر! میں شہادت کے لئے اس قدر بیتاب ہوں کہ اب اور انتظار نہیں کرسکتا۔ زندگی کا ہر لمحہ اب میرے لئے دوبھر ہے۔ مجھے اکیلے ہی دشمن کی صفوں میں گھس جانے کی اجازت بخش دیجئے

کیونکہ میں جلد سے جلد رسول اللہ کے جھنڈے تلے پہنچنا چاہتا ہوں۔ ہاں اگر آپ نے رسولِ پاک کو کوئی پیغام دینا ہو تو فرما دیجئے۔ اس نے شوقِ شہادت کو دیکھ کر حضرت ابو عبیدہؓ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور کہنے لگے اے نوجوان! عشقِ رسول کی بدولت تُو میرے لئے بڑے احترام کے لائق ہے۔ اللہ تیری آرزو پوری کرے۔ جب تُو حضور پاک کے جھنڈے تلے پہنچے تو میری طرف سے لاکھوں سلام و درود کے بعد عرض کرنا کہ خدائے پاک نے آپ کی امت پر بہت فضل و کرم کیا ہے۔ آپ نے فتوحات کے بارے میں ہم سے جو وعدے فرمائے تھے، وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے پورے ہو رہے ہیں۔

اس جذبے سے سرشار مسلمان رومیوں پر پل پڑے۔ دونوں فوجیں لڑتے لڑتے دو ندیوں کے درمیان ایک تنگ مقام پر جا پہنچیں۔ پل پر مسلمانوں نے سرتوڑ کوشش کے بعد قبضہ کر لیا، جس سے رومیوں کے رسل و رسائل کے سارے ذرائع کٹ گئے۔ مسلمانوں کا

دباؤ ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت خالدؓ نے دشمن کے قلب پر حملہ کر کے ایک تہلکہ مچا دیا۔ سامنے پُل تھا اور پیچھے پہاڑ۔ رومیوں کے بچ نکلنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ پادریوں کی دعائیں بے سود ثابت ہوئیں۔ صحرائی بہادروں کے سامنے ٹھہرنا ناممکن ہوا تو رومیوں نے وادی کا رُخ کیا، جہاں وہ ایسے پھنسے کہ پھر زندہ نہ نکل سکے۔ ایک حصہ میدان جنگ میں کام آیا۔ ایک حصے کو عربوں نے دریا میں دھکیل دیا، جو بچ کر بھاگے وہ دریا کی دوسری طرف مارے گئے۔ خود ہرقل کا بھائی جو فوجوں کا سالار تھا میدانِ جنگ میں ہلاک ہوا۔

ہرقل کے بڑے بڑے جنگی جرنیل اور فوجی سردار اس جنگ میں کھیت رہے۔ محتاط اندازے کے مطابق رومیوں کے ایک لاکھ کے لگ بھگ آدمی مارے گئے۔ لڑائی صبح سے شام اور شام سے اگلی صبح تک جاری رہی اور اگلے دن ملک شام کی تقدیر پر آخری مہر لگ گئی۔

جنگِ یرموک اسلامی تاریخ میں ایک سنگِ میل
ی حیثیت رکھتی ہے۔ رومی سلطنت پہ یہ ایک کاری
ضرب تھی۔ وہ ایسے لڑکھڑائے کہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے۔
رد ہرقل نے اپنی مکمل شکست اور مسلمانوں کی مکمل فتح
ی حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کر لیا۔ اس کے
فاظ اس امر کا بیّن ثبوت ہیں۔

"الوداع اے سرزمینِ شام۔ کتنا حسین اور
کتنا پیارا ہے یہ ملک جو دشمن کے حوالے
ہو رہا ہے۔"

جنگِ نہاوند یا فتح الفتوح

(فتح ایران)

جنگِ قادسیہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ وہ ایر
حکومت کے لئے خطرے کا بگل تھا۔ اس فتح کے
مسلمانوں پر سر زمینِ ایران کے دروازے کھل گئے
اس کے چند سال بعد فتح یرموک نے رہی سہی کسر
پوری کر دی۔ نہ صرف سرزمین شام کو عربوں
قدموں میں ڈال دیا بلکہ ایرانیوں کی کمر ہمت بھی
دی لیکن ایران ایک عظیم سلطنت تھی محض ایک ہی
سے اس کا فیصلہ ممکن نہ تھا۔ خود یزدگرد کو یقین
کہ حالات کا پانسہ پلٹنے کے لئے اس میں ابھی دم
باقی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا بڑھتا ہوا سیل
آخر کہیں نہ کہیں ایرانی سرحدوں پر رک جاتے

مگر جب خوزستان پر بھی مسلمانوں نے قبضہ جما لیا تو یزدگرد کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے بڑے بڑے ایرانی سرداروں کو مرو میں اکٹھا کیا اور اس خطرناک صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ ایرانی سرداروں نے کہا کہ اب حالات نہایت خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اگر مل کر پوری قوت اور ہمت سے کام نہ لیا گیا تو ایرانی سلطنت کا چراغ گل ہو جائے گا۔

یزدگرد اس خطرے سے پہلے ہی پوری طرح آگاہ تھا اور مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ اس نے تمام صوبوں کے حاکموں اور چھوٹے بڑے فرمانرواؤں کو حکمنامہ لکھ بھیجا کہ جتنی فوج بھی ممکن ہو لے کر شاہی جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ ایران کے ہر گوشے سے فوجیں امڈی چلی آ رہی تھیں اور چند ہی دنوں میں دو لاکھ جری سپاہی اکٹھے ہو گئے۔ یزدگرد نے ان فوجوں کی کمان ایران کے مشہور سالار مردان شاہ کے سپرد کی اور درفش کاویانی جو ایرانیوں کے نزدیک مدتوں سے فتح و نصرت کا نشان تھا اس کو تھما کر بڑی دھوم دھام سے روانہ

کیا۔ اپنی فوجوں کی کثرت کے نشے میں چوُر سالار نے اپنے شہنشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو نہ صرف ایرانی سرحدوں سے مار بھگائے گا بلکہ ہمیشہ کے لئے انھیں کچل کے رکھ دے گا۔ ان بلند بانگ دعووں کے درمیان اُس نے اپنی فوجوں کو نہاوند کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

حضرت عمر کا دورِ خلافت تھا۔ خلیفہ نے اس صورتِ حال سے اطلاع پائی تو فوراً مجلس مشاورت بلائی عام رائے تھی کہ خلیفۃ المسلمین اس ٹڈی دل لشکر کے مقابلے کے لئے خود نکلیں لیکن حضرت علیؓ کی رائے ان سے مختلف تھی۔ آپ نے فرمایا کہ خلیفہ کا بنفسِ نفیس جانا قرینِ مصلحت نہیں۔ اس سے عرب کے اندر دشمنوں کو سر اٹھانے کا موقع ملے گا۔ بہتر ہے آپ بھی تمام مفتوحہ علاقوں سے فوج کے حصے بلا کر ایک جھنڈے تلے جمع کر کے کسی تجربہ کار جرنیل کی کمان میں مقابلے کے لیے بھیجیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اسلامی فوجیں جمع ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے نعمان بن مقرن کو ان کا سپہ سالار مقرر کر کے مفید مطلب ہدایات دیں اور نہاوند کی طرف بڑھنے

حکم دیا۔ نعمان بن مقرن پہلے جنگ قادسیہ کے دنوں میں شاہِ ایران کے پاس اسلامی وفد کے قائد بن کر جا چکے تھے۔

اسلامی فوج نے نہاوند سے چند میل ادھر ہی ڈیرے ڈال دیئے۔ دونوں فوجوں کے درمیان محض چند میل کا فاصلہ تھا۔ ایرانی سپہ سالار نے صلح کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ طرفین سے ایلچی نامہ و پیام لے کر آئے اور گئے مگر یہ ساری گفت و شنید بے سود ثابت ہوئی۔ ایرانی سپہ سالار اپنی فوجوں کی کثرت اور طاقت کے نشے میں مخمور تھا۔ اس نے مسلمانوں کی شرائط کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا یعنی طرفین میدانِ جنگ میں قسمت آزمائی کریں۔

اگلے دن جنگ کا بگل بجا۔ ایرانی فوجیں بڑے ٹھاٹھ باٹ سے آگے بڑھیں۔ ادھر اللہ کے سپاہی بھی فولاد میں ڈوب کر نکلے۔ ایران کی لڑائیوں میں قادسیہ کے علاوہ ایسی خونریز جنگ کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ طرفین ڈٹ کر بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے دادِ شجاعت

دبے رہے تھے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ فوجیں خاک و خون میں لت پت تھیں۔ کشت و خون کا یہ عالم تھا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ جم کر لڑنا سوار اور پیدل دونوں کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک ایک تیر اسلامی فوج کے سپہ سالار نعمان بن مقرن کو لگا۔ ساتھ ہی گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر آ رہے۔ یہ زخم کاری تھا مگر آپ نے گرتے ہی اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ دوستو! میری فکر نہ کرو۔ اور نہ کسی کو میرے اس کاری زخم کی خبر ہونے دو، ورنہ فوج کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ جس طرح زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اسی طرح فتح و شکست بھی اسی کی طرف سے ہے۔ وہ سب سپہ سالاروں کا سپہ سالار ہے۔ اللہ کا نام لے کر لڑائی جاری رکھو۔ یہ کہہ کر اسلامی پرچم اپنے بھائی نعیم کے حوالے کیا اور کہا کہ اسی کی سر بلندی میں عرب اور اہلِ عرب کی سلامتی ہے۔ اسے جان کی بازی لگا کر بھی بلند رکھنا۔ دن ڈھل گیا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تو مسلمانوں کے حملے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔

جونہی مسلمانوں نے ان کے قدم اکھڑتے دیکھے تو بل کر ایک شدید حملہ کیا۔ ایرانی مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ ادھر فرشتے سورج کو مغرب کی لحد میں اتار رہے تھے۔ ادھر ایرانی بیس ہزار لاشوں کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ مسلمانوں کو خدا نے فتح مبین بخشی۔

فتح کے شادیانے بجے۔ مسلمان سردار اور سپاہی حضرت نعمان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ ابھی دم باقی تھا۔ ایک نے آگے بڑھ کر سپہ سالارؓ کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ نعمانؓ نے آنکھیں کھولیں اور نہایت ہی مدھم آواز میں پوچھا جنگ کا کیا بنا؟

جواب ملا۔ اللہ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی ہے۔ نعمان کے چہرے پر زندگی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ الحمد للہ کہہ کر ڈوبی ہوئی آواز میں فرمایا۔ یہ خوشخبری امیر المومنین کو پہنچا دو۔ یہ کہہ کر ابدی نیند سو گئے۔

حضرت عمرؓ کو اس جنگ کے نتیجے کا شدت سے انتظار تھا۔ جب قاصد فتح کی خوشخبری لے کر پہنچا تو نہایت خوش ہوئے مگر جونہی حضرت نعمانؓ کی شہادت کی

خبر سُنی ۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگے ۔

جنگِ نہاوند ایرانی سلطنت کی موت کا بگل تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی نہ اُٹھ سکے ۔ ایران کی قدیم سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا ۔ اہلِ عرب اس یادگار فتح کو فتح الفتوح کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

سانحہ کربلا

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت کے سوال پر ایک دفعہ پھر مسلمانوں میں تلواریں کھنچ گئیں اور وہ وقت دور نہ تھا جب مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ جاتا۔ مگر حضرت حسنؓ نے بڑے ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ حضرت حسینؓ نے انھیں ایسا کرنے سے روکا بلکہ سخت مخالفت بھی کی۔ مگر جب حضرت امام حسنؓ نے اعلان کر دیا تو اتنی زبردست مخالفت کے باوجود بھی آپ خاموش ہو گئے اور فوراً بھائی کی بات کو مان لیا اور پھر اس سلسلہ میں لب

تک نہ ہلایا۔ حضرت امام حسنؓ کی شہادت کے بعد آپ نے اگرچہ امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی مگر بظاہر تعلقات اچھے رہے۔

امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ چند لوگ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اُس کی خلافت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں حضرت امام حسینؓ کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

مرنے سے پہلے امیر معاویہؓ نے یزید کو وصیت کی تھی کہ بیعت کے لئے امام حسینؓ کو مجبور نہ کرنا اور ان سے نیک سلوک کرنا۔ ان کی رگوں میں پیغمبر پاک کا مقدس خون ہے مگر یزید نے حکومت کے نشے میں اس وصیت کی کوئی پروا نہ کی۔ تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی اس نے مدینہ کے حاکم کو لکھ بھیجا کہ امام حسینؓ سے ہر حال میں بیعت لی جائے۔

حضرت امام حسینؓ سمجھ گئے کہ اب آزمائش کا وقت آن پہنچا ہے۔ آپ نے بڑی جرأت اور دلیری سے ٹکاسا جواب دیا کہ میں ایک بدکار فاسق کے ہاتھ پر بیعت نہیں

کر سکتا۔ ان کی قربانی، حق پرستی، دینداری اور حق گوئی پہ کربلا کا ذرہ ذرہ پکار کر گواہی دیتا ہے۔ آپ چٹان کی طرح ڈٹ گئے کہ جان جاتے مال جاتے، آل اولاد جاتے، دنیا کی مصیبتیں مجھ پر ٹوٹ پڑیں مگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ حق سے پرے ہٹ کر ایک ظالم کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں۔ آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

کوفہ حضرت علیؓ کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ جب وہاں کے لوگوں کو پتہ چلا کہ حضرت امام حسینؓ یزید کی حکومت کو نہیں مان رہے تو انھوں نے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ پھل پک چکے ہیں۔ کھجوریں سرسبز ہیں۔ دریا جوش میں ہے۔ فوجیں بھی آپ کا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ آپ آئیں حالات ہر طرح آپ کے موافق ہیں۔ آپ نے ان کی صدا پر لبیک کہا۔ مکہ والوں نے آپ کو بہت روکا مگر آپ نہ رکے۔

چونکہ مومن سادہ دل ہوتا ہے۔ آپ تمام آل رسول سمیت جن کی کل تعداد مرد و زن اور بچوں سمیت ۷۲

بھی کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کتنی غلطی ہے، یہ کہنا کہ امام حسینؓ جنگ کے لئے روانہ ہوتے۔ بچو! تم خود ہی سوچو جنگ پر جانے والے یوں جایا کرتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے اور بیبیاں بھی ہمراہ ہوں۔ جنھیں کبھی چاند ستاروں نے بھی نہ دیکھا ہو۔

جب یزید کو معلوم ہوا کہ امام حسینؓ کوفہ جا رہے ہیں تو اس نے وہاں کے حاکم کو فوراً بدل دیا اور ابن زیاد کو کوفے کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ وہ بڑا سنگدل اور ظالم حکمران تھا۔ اس نے کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر مار پیٹ کر اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ لوگ امام حسینؓ کی حمایت سے پھر گئے۔ امام حسینؓ راستے ہی میں تھے کہ انھیں کوفہ کے لوگوں کی وعدہ خلافی کا پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے بھائی مسلم بن عقیل اور ان کے دو بیٹوں کو بھی ابن زیاد نے شہید کر دیا ہے۔ راستے میں عرب کا مشہور شاعر بھی ملا جس نے بتایا کہ یا امام! کوفہ والوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔ مگر امام حسینؓ اس راہ میں جو

اللہ کی راہ تھی اپنا قدم آگے بڑھا چکے تھے اور مومن کا قدم جب خدا کی راہ میں اُٹھ جاتا ہے تو پھر واپس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ البتہ امام حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے ضرور کہا کہ تم میں سے جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں وہ خوشی سے جا سکتے ہیں۔ میں اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں لیکن کوئی بھی آپ کا ساتھ چھوڑنے پہ آمادہ نہ ہوا ۔ حتیٰ کہ اس مختصر سے قافلے کے ساتھ امام حسینؓ محرم کی دو تاریخ کو دریائے فرات کے کنارے کربلا کے میدان میں جا اُترے ۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ معاملہ ہی اور ہے۔ کربلا کی زمین خون کی پیاسی نظر آئی ، مگر آپ نے حق کا راستہ اختیار کیا اور ان کی ہر بات اور شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا ۔ یزید کی فوجوں نے آپ پہ پانی بند کر دیا۔ امام حسینؓ نے یزیدی فوجوں کو مخاطب کرکے جو خطبہ ارشاد فرمایا اُسی سے ان کے مقام کی بلندی ، استقلال اور حق پرستی کا پتہ چلتا ہے ۔ فرمانے لگے ۔ " اے لوگو! جلدی نہ کرو ۔ عجلت کارِ شیطان ہے ۔ میری بات سُن

لو۔ نصیحت کرنا اور سیدھی راہ دکھانا میرا فرض ہے۔ اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمھارے اختیار میں ہے۔ اگر انصاف سے کام لوگے تو خوش بخت رہو گے اور اگر تم نے نا انصافی سے کام لینا ہے تو سب مل کر ایک بات ٹھہرا لو، تاکہ تمھارا ارادہ کسی پر پوشیدہ نہ رہے۔ تم میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر ڈالو، مجھے اس کی ذرہ بھر پروا نہیں۔ اللہ میرا حامی و مددگار ہے لیکن تم ذرا یہ تو سوچو کہ میں کون ہوں۔ اپنے دل سے پوچھو کہ کیا میرا قتل اور میری بے حرمتی تمھیں زیب دیتی ہے۔ کیا میں تمھارے پیارے نبی کا جگر گوشہ نہیں ہوں؟ کیا میں حضرت علیؓ کا جو آنحضرت کے چچیرے بھائی ہیں، بیٹا نہیں ہوں کیا تم نے رسول کریمؐ کو ہمارے حق میں یہ کہتے نہیں سُنا کہ ہم جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں؟ اگر تم بھول گئے ہو تو جاؤ نبی کریم کے صحابیوں سے جو ابھی زندہ ہیں جا کر پوچھو کہ ہم کیا ہیں اور ہمارا مقام کیا ہے؟ کیا یہ باتیں تمھیں ظلم سے نہیں روک سکتیں؟ اگر ان باتوں میں بھی کوئی تاثیر نہیں تو کیا میں فاطمہ کا لال نہیں

ہوں ؟ کیا میرے سوا اس وقت دنیا میں نبی کا نواسہ کوئی اور بھی ہے ؟ کہو میں نے تم میں سے کسی کا خون بہایا۔ جو تم مجھ پر یہ ظلم کرنا چاہتے ہو۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ میں یزید کی بیعت کیسے کر سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اپنا ہاتھ اُس ذلیل، ظالم اور فاسق کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دوں گا۔"

اس کے بعد کسے علم نہیں کہ کیا ہوا۔ کربلا کے میدان کی تپتی ہوئی ریت، ریگستان کی جھلس دینے والی گرمی اور لُو اور اس پہ پانی کی بندش۔ اپنے بچوں کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا۔ انھیں خاک و خون میں لت پت دیکھا مگر امام حسینؓ وہ کامل انسان تھے کہ موت کو دیکھ کر مسکراتے۔ ظلم کا تنہا مقابلہ کیا۔ کربلا کو اپنے اور اپنی آل کے خون سے رنگین کر دیا۔ مگر حق پر قائم رہے۔ ذرا غور کریں یزید کی بیعت سے آپ کو کیا کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ زرخیز سے زرخیز صوبے کی حکومت، بڑے سے بڑا عہدہ، مال و دولت کے ڈھیر، مگر خدا پرست حسینؓ کی نگاہوں میں یہ سب کوئی

قیمت نہ رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مومن کی شان کے خلاف ہے کہ دنیا کے مال و دولت کی خاطر دین کا راستہ چھوڑ ہے۔ قربانی کی وہ مثال پیش کی کہ آج تک دنیا حیران ہے۔

ایک ایک کر کے ان کے عزیز و اقربا اور ساتھی بھوکے اور پیاسے ان کی نظروں کے سامنے شہید ہوئے لیکن ان کا قدم نہ ڈگمگایا۔ جب آپ تن تنہا رہ گئے تو خود میدان میں اُترے۔ جس طرف آپ بڑھتے دشمن کے سپاہی بھیڑوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے۔ آخر ظالموں نے آپ پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ تیروں سے آپ کا جسم چھلنی ہو گیا اور آپ گھوڑے پر سے گر پڑے۔ نماز ظہر کا وقت تھا۔ آپ نے اسی حالت میں خدا کی بارگاہ میں آخری سجدہ کے لئے سر جھکا دیا۔ آپ سجدے میں تھے کہ سنگدل شمر نے آپ کا سر جسم سے علیحدہ کر دیا۔ سچائی کی راہ میں اتنی بڑی قربانی کی مثال تاریخِ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ کربلا کی ریت کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ حسین ہی دینِ محمدی

کی پشت پناہ ہے، جس نے امتِ محمدیہ کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچ کر ہرا بھرا کر دیا اور اسلام کو اِک نئی زندگی بخشی۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ننھا جرنیل

اور

فتح ہسپانیہ (اندلس)

اسلامی دورِ حکومت میں خلیفہ ولید بن عبد المالک کا زمانہ شاندار فتوحات کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ اس کی تمام تر فتوحات کا سہرا مختلف جرنیلوں کے سر ہے۔ جنھوں نے حجاز سے لے کر بربر (افریقہ)، ہندوستان اور ہسپانیہ تک اسلامی حکومت کے ڈانڈے ملا دیئے۔ ہسپانیہ کی فتح کا سہرا اُس کے نامور جرنیل موسیٰ ابنِ نصیر اور اس کے چہیتے غلام اور ننھے فوجی مشیر طارق ابنِ زیاد کے سر ہے۔

جن دنوں افریقہ کے شمالی علاقوں پر مسلمانوں کا پوری طرح تسلط ہو چکا تھا، ساحل کے پار ہسپانیہ میں "راڈرک" حکمران تھا۔ راڈرک ایک غاصب

انسان تھا جس نے دھوکے سے اصل بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار کر خود تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور پھر سلطنت کے نشے میں اس نے رعایا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کیا۔ وہ پہلے درجے کا عیاش آدمی تھا۔ کسی آدمی کی عزت و آبرو اور ننگ و ناموس اُس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ اُس کے اپنے ڈیوک اور گورنر بھی اُس کی عیاشیوں اور عیاریوں سے نالاں تھا اور ہر وقت اس سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ وہ ساحل کے اُس پار بڑی حسرت بھری نگاہوں سے تکتے جہاں مسلمانوں کے عدل و انصاف اور رعایا پروری کا ہر سُو چرچا تھا۔ آخر تنگ آکر ان کا ایک وفد سبتہ کے ڈیوک کی سرکردگی میں طنجہ کے ساحل پر طارق ابنِ زیاد سے مِلا اور اپنی بدحالی اور بپتا کا رونا رو کر مسلمانوں سے مدد مانگی "اور یقین دلایا کہ اگر آپ سسکتی ہوئی انسانیت کے نام پر ہماری مدد کریں تو اُس سرسبز و شاداب ملک کی رعایا یقیناً آپ کا ساتھ دیگی۔

نو عمر طارق ان دنوں مسلسل جنگی فتوحات کے بعد اپنے

سات ہزار سپاہیوں سمیت ساحلی علاقے میں آرام کر رہا تھا
خود اس کی اپنی نگاہیں بارہا ساحل کے اُس پار والے
علاقے کی طرف اُٹھ چکی تھیں لیکن سمندر پار کرکے اس
ملک پر حملے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اب وہاں کے عوام
نے مسلمانوں کی دہائی دی تو طارق نے اپنے آقا اور جرنیل
موسیٰ ابنِ نصیر کو سارا حال لکھ بھیجا اور اجازت طلب کی
اگرچہ موسیٰ ابنِ نصیر بھی نئی سرزمین میں پیغام حق سنانے کے
لئے بیتاب تھے۔ لیکن وہ محتاط سالار تھے۔ جب تک
حالات کا یقینی طور پر پتہ نہ چل جاتا وہ حملہ کرنے کے
حق میں ہرگز نہ تھے۔ انھوں نے طارق کو لکھا کہ ایسا نہ
ہو یہ لوگ ہمارے تمہارے لئے کوئی دھوکے کا جال بچھا
رہے ہوں۔ جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ
واقعی حالات سازگار ہیں اور عوام حقیقتاً ہماری امداد کے
خواہاں ہیں، حملہ کرنا زبردست جنگی غلطی ہوگی۔ یہ خط و
کتابت جاری تھی کہ ہسپانیہ سے ممتاز امراء کا ایک اور
وفد آن پہنچا۔ انھوں نے راڈرک کے ظلم و ستم کی داستانیں
سنا کر طارق سے گڑگڑا کر مدد کی درخواست کی۔ طارق نے

پھر حالات لکھ کر موسیٰ ابن نصیر کو بھیجے۔ موسیٰ نے جواب دیا کہ پورا اطمینان کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس وفد کے سردار ڈیوک سے کہیئے کہ وہ راڈرک کے خلاف لڑائی چھیڑ دے۔ اس سے اصل صورتِ حال کا پتہ چل جائے گا۔ ساتھ ہی موسےٰ ابنِ نصیر نے اپنے ایک آزمودہ کار اور ہوشیار سپاہی "طریف" کو خفیہ طور پر ہسپانیہ بھیجا تاکہ وہ وہاں کے اصل حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور پھر خفیہ رپورٹ پیش کرے۔
اسی دوران میں سپتہ کے ڈیوک نے بغاوت کرکے ساحلی علاقوں کو پامال کر ڈالا۔ جب ہر طرف سے بالکل اطمینان ہوگیا تو موسیٰ ابنِ نصیر نے طارق کو آگے بڑھ کر حملے کی اجازت دے دی اور لکھ بھیجا کہ "مجاہدو! اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو مگر یاد رکھو اختلاف اور ضعفِ ایمان سے بچنا۔ اللہ کی طرف سے تائید اور نصرت نیت کے مطابق آتی ہے اور اجر ہمیں بقدر خلوص کے ملتا ہے۔ کسی مشکل میں گرفتار ہوکر پریشان ہونا مسلمان کے شایانِ شان نہیں کیونکہ نصرتِ الٰہی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی

ہے۔ فوجوں کی کثرت و قلت کا خیال دل میں نہ لانا اور
اپنے امیر کی پوری اطاعت کرنا۔"

طارق اس حکم کے ملتے ہی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اپنے سات ہزار سپاہیوں کو سات دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کو ایک جہاز میں سوار کر کے ساحل کے اُس پار اترنے کا حکم دیا۔ خود طارق آخری جہاز میں سوار ہو کر اپنے بہادر سپاہیوں سے ساحل کے اس پار جا ملا۔

ہسپانیہ کی سرزمین پر جب فوجیں صحیح سلامت اتر گئیں، تو ننھے جرنیل نے ایک ایسا حکم دیا جس کی نظیر پوری دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ توکل اور شوقِ شہادت سے سرمست ننھے جرنیل نے ان سارے جہازوں کو آگ لگا کر جلا دینے کا حکم دیا۔ یہ حکم سنتے ہی فوج کے تجربہ کار جرنیل اور عمر رسیدہ و جہاں دیدہ سپاہی دنگ رہ گئے۔ ان کے نزدیک اس ننھے جرنیل کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ ہمت کر کے سارے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تاکہ اُسے اس کی غلطی کا احساس

دلائیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس واقعہ کو بڑے خوبصورت پیرایہ میں یوں منظوم کیا ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بنگاہِ خرد خطا ست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد وگفت
ہر ملک ، ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

جس کا مطلب یہ ہے کہ طارق نے جب اندلس کے ساحل پر کشتیوں کو نذرِ آتش کر دیا تو سبھی نے کہا کہ اے ننھے جرنیل! تمھارا یہ اقدام عقل کے نقطۂ نگاہ سے اک فاش غلطی ہے۔ آخر ہم غیروں کی سرزمین میں ہیں۔ جہاں ہر سو دشمن ہی دشمن ہیں۔ اپنے وطن سے کالے کوسوں دور اگر ہمیں ناساز گار حالات پیش آئیں تو کیا بنے گا۔ اے جرنیل! بہتر اور لائق وہی جرنیل ہوتا ہے جو فرار کی راہ کے متعلق پہلے ہی سے تدبیر سوچ رکھے۔ آخر شریعت بھی تو حفاظتی تدابیر کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ خدانخواستہ

اگر شکست ہوئی تو دشمن کے اس ملک میں بچاؤ کی کیا تدبیر ہوگی ۔ ننھا جرنیل مسکرایا اور اپنا ہاتھ اپنی شمشیر کے قبضہ پر رکھتے ہوئے کہا، تم اسے دشمن کا ملک کہتے ہو۔ یاد رکھو دنیا کا ہر ملک ہمارا ملک ہے اس لئے کہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے اور ہم اللہ کے سپاہی ہیں،

نوعمر جرنیل کے ان الفاظ کو سن کر سبھی نے سر جھکا دیئے اور اپنی غلطی پہ نادم ہوئے اور پھر سبھی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ۔ اب انھیں اس وقت کا انتظار تھا کہ جنگ کا بگل بجے اور وہ دادِ شجاعت دے سکیں ۔

جنگ کے آغاز سے پہلے ان کے دلوں کو جوشِ جہاد سے گرمانے کے لئے طارق نے انھیں ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلائے اور کہا کہ تم لکڑی کے تختوں کا سہارا لینے کے بجائے اپنے خدا کا سہارا کیوں نہیں لیتے ۔ توکل مسلمان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے ۔ شاید تم بھول رہے ہو ہم لوٹنے یا بھاگنے کے لئے یہاں نہیں آتے ۔ تم اللہ کے سپاہی ہو تم اس کی توحید کا پیغام سنانے کے لئے آگے بڑھے ہو ۔ تم نے کمزوروں، مظلوموں

اور ستم زدہ لوگوں کو ظلم و ستم کے پنجے سے رہائی دلانی ہے۔ یاد رکھو تمہارے سامنے دشمن اور پیچھے سمندر ہے۔ پیچھے ہٹو گے تو سمندر کی بپھری ہوئی لہریں تمھیں نگل جائیں گی۔ میں جانتا ہوں تمھاری تعداد بہت کم ہے اور دشمن کی فوج ان گنت ہے۔ اس کے پاس بے شمار اسلحہ اور ہتھیار ہیں۔ لیکن رسولِ خدا کا فرمان یاد رکھو اور مسلمانوں کے کارناموں کو سامنے رکھو تو تمھیں پتہ چل جائے گا کہ فتح و شکست کا انحصار فوجوں کی کثرت اور قلت پر نہیں بلکہ ایمانی جذبے پر ہے۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ اقلیت نے ہمیشہ اکثریت کو نیچا دکھایا ہے۔ نورِ ایمان کی روشنی میں آگے بڑھو، مظلوموں کا ہاتھ پکڑو۔ انھیں پیغامِ حق سناؤ۔ اپنے ایمان، قوتِ بازو اور اپنے خدا پر بھروسہ کرکے حملہ کرو۔ نصرتِ الٰہی تمھاری منتظر ہے۔

نوعمر جرنیل کی اس تقریر نے فوجوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بربر کے سپاہی اب دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ سب سے پہلے سرحدی گورنر کی فوجوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی، جسے مسلمانوں نے پہلے ہی

حملے میں کچل کے رکھ دیا۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی کھیت رہے اور جو باقی بچے وہ دم دبا کر بھاگ گئے۔ راڈرک نے اس شکست کی خبر سنی تو ہکا بکا رہ گیا۔ وہ خود ان دنوں ہمسایہ ملک کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ طاقت کے نشے میں چور اور مغرور راڈرک نے خیال کیا کہ پہلے حملہ آوروں سے نپٹ لوں۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے خطرے نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ساری فوجوں کو یکجا کر کے ایک ہی مرتبہ مسلمانوں کا کام تمام کر دے۔ ایک لاکھ فوج لے کر وہ بڑی سج دھج اور دھوم دھام سے ساحل کی طرف بڑھا۔ یہ سفر اُس نے اپنی فوجوں اور سرداروں کے ہمراہ کوئی تین ہفتے میں طے کیا اور پھر ہسپانیہ کی فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے ایک نہر کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔

ادھر موسیٰ ابنِ نصیر اپنے عزیز شاگرد اور ننھے جرنیل کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ پہلی جنگ میں کامیابی پر طارق کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور ساتھ ہی پانچ ہزار تجربہ کار، جنگجو سپاہی ساحل کے اس پار کمک کے لیے بھیج

دیتے جس سے سپاہیوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ اب طارق اپنے بارہ ہزار مجاہدوں کو لے کر آگے بڑھے اور نہر کے دوسرے کنارے پر اترے۔ دشمن کے ٹڈی دَل فوج کو دیکھ کر طارق نے اپنے مجاہدوں کا خون گرمانے اور ان میں روحِ جہاد پھونکنے کے لئے کہا۔

اے کشتیاں جلا کر آنے والے سپاہیو! دشمن تمھارے ساتھ آج پھر نبرد آزما ہونا چاہتا ہے۔ ایسے دن اور ایسے مواقع بار بار ہاتھ نہیں آتے۔ بہادروں کے لئے جنگ و جہاد کا دن عید کے دن سے بھی زیادہ مسرت افزا ہوتا ہے۔ کثرت و قلت کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ ہماری تو یہ سنت ہے کہ اقلیت نے اکثریت کو شکست دی ہے۔ جنت کے دروازے تمھارے لئے کھول دیئے گئے ہیں۔ بڑھو اور بڑھ کر اپنے دل کی مراد حاصل کرو۔ یاد رکھو اللہ انہی کو عزیز رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف آرا ہوتے ہیں۔

پھر ہاتھ اٹھا کر اپنے خدا کے حضور میں دعا مانگی جسے ہمارے قومی شاعر علامہ اقبالؒ نے یوں منظوم

کیا ہے ؂

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

لڑائی شروع ہوئی۔ فریقین گتھم گتھا ہو گئے۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام اور پھر رات کی تاریکی کا پردہ۔ اگلے روز پھر جنگ کا بگل بجا۔ دونوں فوجوں نے بڑی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا مگر دونوں پلڑے برابر رہے۔ آٹھویں دن طارق نے فوجوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آج کا دن خدا کے فضل سے فیصلہ کن ہوگا۔ میں خود آج ہی قطعی اور فیصلہ کن قدم اٹھاؤں گا۔ مل کر حملہ کرو اور جنگ کا پانسہ پلٹ دو۔ یہ کہا اور اپنا خاص دستہ لے کر دشمن کی فوجوں کے قلب میں گھس گیا، جہاں راڈرک اپنے مرصع اور جڑاؤ تخت پر جلوہ افروز تھا اور ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ راڈرک کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل

گئی ۔ اس سے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ مسلمانوں کی بارہ ہزار ۔ فوج نے دشمن کی لاکھ سے زائد فوج کو شکست فاش دی ۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ آخری دن مسلمانوں نے راڈرک کی فوجوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا ۔ کوئی نصف کے قریب اس کی فوج ماری گئی اور باقی جانیں بچا کر جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلے ۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ اتنے بڑے ملک کی قسمت کا فیصلہ ایک ہی جنگ میں ہو جائے ۔ مسلمانوں کی بہادری اور دلیری کی ایسی دھاک بندھی کہ کسی اندلسی حاکم یا رئیس کو پھر مسلمانوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی اور آہستہ آہستہ سارا سپین مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا ۔

سپین پر مسلمانوں نے آٹھ صدیوں تک حکومت کی ۔ جن دنوں یورپ پر جہالت اور تاریکی کے سائے چھائے ہوئے تھے ، سپین کا خطہ اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے نور سے چمک رہا تھا ۔ مگر کچھ اسات سو سال حکومت کرنے کے بعد مسلمانوں پر ایسا زوال آیا کہ وہ

سپین کی سرزمین سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال بھی کہیں نہ مل سکے گی کہ کسی قوم نے کسی خطے پر سات آٹھ سو سال تک حکومت کی ہو اور پھر وہاں ان کے کسی فرد کا نام ونشان تک نہ ہو۔ اس حکومت کی ہو اور پھر وہاں ان کے کسی فرد کا اس حسرت ناک انجام کو علامہ اقبال کے ان شعروں میں دیکھیے گا ؎

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم تو پاک ہے میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تیری بادِ سحر میں

فتح قسطنطنیہ

حضور سردرِ کائنات کی ایک پیشین گوئی تھی کہ "اے مُسلمانو! اے اللہ کے سپاہیو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ خوش نصیب ہوگی وہ فوج اور اس کا امیر جن کے ہاتھوں یہ کام مکمل ہوگا۔ وہ سب جنّتی ہوں گے۔" مسلمانوں نے اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں امیر معاویہؓ ہی کے زمانے سے قسطنطنیہ پر حملے شروع کر دیئے۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور صدیاں گزر گئیں۔ ہزار ہا مسلم مجاہدین قسطنطنیہ کی دیواروں تلے شہید ہوگئے۔ انہی شہیدوں میں حضرت ایوب انصاریؓ بھی ہیں جنھیں مدینہ منورہ میں رسولِ پاکؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا

تھا۔ جب آپ شہید ہوئے تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ مجھے قسطنطنیہ کی دیواروں کے جتنا قریب دفن کرسکو بہتر ہوگا۔ میری کشش سے مسلمان ان دیواروں تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اور پھر جنگ کی ایک تاریک رات کو مسلمان رسولِ خدا کے اس معزز میزبان کی لاش کو چپکے سے قسطنطنیہ کی دیواروں کے ساتھ دفن کر رہے تھے۔

قسطنطنیہ کی فتح کا اعزاز خدا نے سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھ رکھا تھا۔ وہ ۱۴۵۱ء میں اکیس سال کی عمر میں ترکی کے تخت پر بیٹھا۔ ادھر قسطنطنیہ میں ان دنوں قسطنطین یازدہم کی حکومت تھی۔ وہ بڑا کایاں انسان تھا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان محمد فاتح ابھی عین عالم شباب میں ہے، کیوں نہ اس کی نو عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مگر اس نے جو کچھ سوچا اور سمجھا وہ سراسر غلط تھا۔ سلطان محمد کو خدا نے اعلیٰ دل و دماغ اور فوجی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اُسے اپنے باپ کی وصیت خوب یاد تھی، جس نے بسترِ مرگ پر اسے

حضور کی پیشگوئی کی نسبت سے قسطنطنیہ فتح کرنے کی ترغیب دی تھی۔ وہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا عزم کر چکا تھا۔ شاید وہ اس حملے میں کچھ دیر اور لگاتا مگر قسطنطین کی جلد بازی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک ترکی شہزادہ اس کے پاس نظر بند تھا جس کا خرچ ترکوں کی طرف سے ادا ہوتا تھا۔ قسطنطین نے ایک سفیر کے ذریعے سلطان کو کہلا بھیجا کہ اس کے اخراجات میں اضافہ کر دو ورنہ اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ہم اس ترکی شہزادے کو تمہارے مقابلے میں ترکی کا حکمران تسلیم کر لیں گے۔ سلطان نے سفیر کو تو کسی حیلے بہانے چلتا کیا مگر قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریوں کو تیز تر کر دیا۔ عیسائیوں اور ترکوں دونوں کے لئے قسطنطنیہ کی بڑی اہمیت تھی اور اس شہر کے محلِ وقوع اور دفاعی استحکامات نے اسے ناقابلِ تسخیر قلعہ بنا رکھا تھا۔ یہ شہر ایک تنگ جزیرہ نما پر واقع ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں بحیرہ مارمورا، شمال میں شاخ زریں کا دہانہ اور مغرب کی طرف خشکی کا ٹکڑا۔ گویا اس تکونی شہر کے دو حصے پانی سے گھرے ہوئے

تھے۔ حملہ آور فوجیں صرف خشکی کی سمت سے حملہ کرسکتی تھیں۔ اس لئے اس حصے کے دفاع کے لئے خاص انتظامات کیے ہوتے تھے۔ یکے بعد دیگرے تین دیواریں تعمیر کی ہوئی تھیں۔ یہ بلند و بالا دیواریں فصیل کا کام دیتی تھیں۔ ان کے درمیان بہت گہری اور چوڑی خندقیں بھی تھیں۔ جنھیں ضرورت کے وقت پانی سے بھر دیا جاتا تھا۔ اُن دنوں ایسی دیواریں ہر قسم کے حملوں سے محفوظ سمجھی جاتی تھیں۔ اور اُس وقت تک ان دیواروں کو کوئی نہ توڑ سکا تھا۔

سلطان نے سب سے پہلے اپنے ملک کے اندرونی معاملات کو سختی سے درست کیا تاکہ جنگ کی صورت میں اندرونِ ملک میں ہر قسم کا امن و امان رہے، پھر زبردست بحری بیڑہ تیار کیا۔ سلطان کے پاس توپیں تو تھیں لیکن وہ چھوٹی تھیں اور ناکافی۔ اس نے بھاری بھرکم توپیں بنانے کا حکم دیا۔ سب سے بڑی قلعہ شکن توپ کی نال چالیس بالشت یعنی کوئی ستائیس فٹ تھی۔ جس میں کوئی چار بالشت بھر موٹی کانسی استعمال کی گئی تھی۔ اُس نال کی

گولائی کوئی بارہ بالشت کے لگ بھگ تھی۔ یہ توپ اٹھارہ من کا گولہ پھینک سکتی تھی۔ باسفورس کے ساحل پر قسطنطنیہ کے بالمقابل سلطان نے پہاڑی پر ایک زبردست قلعہ بنوایا محاصرہ کے لئے جو بحری بیڑہ تیار کروایا اس میں ایک سو اسّی جہاز تھے۔ قلعہ تیار ہوا تو اس پر دور مار توپیں نصب کر دی گئیں۔ ادھر قسطنطین بھی سلطان اور ترکوں کی تیاری سے غافل نہ تھا۔ اس نے دیواروں کی مرمت کروائی اور رسد کا سامان بہم پہنچایا تاکہ محاصرے کے وقت کام آسکے۔ اس کے علاوہ اس نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے مذہب کے نام پر اپیل کی جس کا خاص اثر تو نہ ہوا تاہم کچھ لوگ ضرور اس کی مدد کو آ پہنچے۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں تو سلطان نے فروری ۱۴۵۳ء میں اللہ کا نام لے کر فوجوں کو کوچ کا حکم دیا سلطان کی ڈیڑھ لاکھ فوج حرکت میں آئی اور ۶، اپریل کو ترکی کی فوجوں نے قسطنطنیہ کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا پھر اس کے تین دن بعد ۹، اپریل کو قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ترکوں نے قسطنطنیہ کو خشکی اور بحیرہ مارمورا کی طرف

سے نو گھیرے میں لے لیا اور توپوں کی گولہ باری سے فصلوں کو بھی چھلنی کر دیا مگر محصورین ہر مرتبہ اپنی جان کی بازی لگا کر اُن شگافوں کو پُر کر لیتے دوسری طرف یونانی فوجیں ترکی بیڑے کو فصیل سے دور رکھنے کے لئے شدید گولہ باری کر رہی تھیں۔ ہر طرف سے آگ ہی آگ برس رہی تھی۔ سلطان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ جب تک شاخ زریں پر قبضہ نہ ہوگا، شہر فتح کرنا ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ تھا کہ اب بحری بیڑا وہاں پہنچے تو کیونکر؟ سمندر کے راستے بندرگاہ کے اس حصے تک بیچ میں خشکی کا ٹکڑا تھا۔ اس مسئلے کا سلطان نے جو حل تلاش کیا وہ اس کی ذہانت، فوجی بصیرت اور عزم و استقلال کی اِک نادر مثال ہے۔ اس نے خشکی پر جہاز چلا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ سلطان نے اس خشکی کے ٹکڑے یعنی آبنائے باسفورس سے شاخ زریں کے دہانے تک، لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی اور ان تختوں پر چربی ملوا کر انھیں خوب چکنا کر دیا اور پھر ایک رات کی تاریکی میں ترک سپاہی ان جہازوں کو دھکیل کر اس چربی

سڑک کے کنارے لے آتے۔ اگلی صبح عیسائیوں نے جو کچھ دیکھا انھیں یقین نہ آتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بہتر[۷۲] جہاز شاخِ زریں کے دہانے پر اتار دیئے گئے۔ اب تک قسطنطنیہ کا یہ حصہ بیرونی حملوں سے محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ اب اس صورتِ حال سے اس طرف حملے کا خطرہ سب سے زیادہ بڑھ گیا جس کا نفسیاتی اثر بھی بہت ہوا۔ عیسائیوں نے خشکی پر جہاز چلانے کو ایک معجزہ سمجھا۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ قسطنطنیہ کو وہی شخص فتح کرے گا جو خشکی پر جہاز چلائے گا۔ اب قسطنطنیہ کا محاصرہ مکمل طور پر ہو چکا تھا۔ بزنطینی بیڑہ مقابلے کے لئے آگے بڑھا مگر تاب نہ لا سکا اور شکست کھا کر پیچھے ہٹا۔ پسپائی میں ترکوں نے ان کے دو جہاز ڈبو بھی دیئے۔ مئی کے آخر میں ترکوں نے بیرونی خندقوں کے بعض حصوں کو پاٹ لیا۔ جب ان دیواروں میں کئی جگہ شگاف پڑ گئے تو سلطان کو یقین ہو گیا کہ اب فتح کچھ دنوں کی بات ہے۔ بزنطینیوں نے حملہ رد کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہزاروں ترک شہید ہوئے لیکن ان کا قدم ہر لحظہ

آگے بڑھ رہا تھا۔ سلطان نے قیصر کو پیغام بھیجا کہ رعایا کے جان و مال کی اب بھی اگر حفاظت درکار ہے تو شہر کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ آخری حملے کا انتظار کرو۔ وہ نہ مانا۔ آخری حملے سے پہلے سلطان اور اُس کی فوج رات بھر خدا کے حضور میں دعائیں مانگتے رہے۔ صبح ہوئی۔ ترکوں نے زبردست حملہ کیا۔ دشمن نے ہر حملے کو روکنے کے لیے سر توڑ کوشش کی، مگر سلطان کے فولادی دستے کے حملے کے سامنے آخر گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ شہر کے پھاٹک کھول دیے گئے۔ گلی کوچوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ قیصر خود لڑتا ہوا مارا گیا اور قسطنطنیہ پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

ظہر کا وقت تھا۔ سلطان محمد ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا اور سینٹ صوفیہ کے گرجے میں جسے اب مسجد ایا صوفیہ کہتے ہیں داخل ہو کر اپنے خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہوا۔

قسطنطنیہ کی فتح تاریخ عالم میں بالعموم اور تاریخ اسلام میں بالخصوص بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ساری دنیائے اسلام میں خوشی و مسرت کے جشن منائے گئے۔

قرار داد لاہور
و
استقلال پاکستان

۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کا دن ہماری تاریخ میں اک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز لاہور کے منٹو پارک پر جسے آج کل اقبال پارک کہتے ہیں اور عین اس جگہ جہاں آج کل مینار پاکستان ہے اسلامیان برصغیر کا ایک تاریخی اجلاس ہوا جس میں مسلمانانِ ہند نے اپنے سیاسی موقف کا اعلان کیا اور قائدِ اعظم نے للکار للکار کر کہا کہ برصغیر میں ہنوز مسلمان زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ کانگرس اور انگریز کے علاوہ ایک تیسری پارٹی بھی ہے اور وہ ہے مسلمان۔

متحدہ قومیت کا ڈھونگ اِک حسین و لفریب چال ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں الگ الگ فلسفۂ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کے رہنے سہنے کا طریق جدا ہے۔ دونوں کا ادب

ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، نہانے دھونے، ملنے جلنے اور لکھنے پڑھنے کے انداز مختلف ہیں۔ ان کا رزمیہ الگ ہے۔ ان کے مشاہیر الگ ہیں۔ ان کے تاریخی سرمائے الگ ہیں۔ در اصل وہ دو الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بنیادیں بالکل متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ مسلمانوں کو ایک جداگانہ گھر کی ضرورت ہے۔ ان دس کروڑ مسلمانوں کو جو اپنی تمدنی اور معاشرتی صلاحیتوں کو اسلامی خطوط پر ترقی دینا چاہتے ہیں۔ انھیں ایک الگ اسلامی ریاست کی ضرورت ہے جو برصغیر کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں مسلم اکثریت کے صوبوں میں بنائی جاسکتی ہے۔

یہ تھی وہ قرار داد لاہور جس نے برصغیر کے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو غلط تصورات سے نکالا اور ان کے سامنے ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دیا اور اس میں کے کلام ہے کہ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن سے اک انقلاب آفرین باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

"استقلال پاکستان"

۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے لاکھوں کے اجتماع میں قائدِ اعظم نے متحدہ قومیت کے حسین جال کو تار تار کر کے رام راج کے منصوبوں کے خواب کو ہمیشہ کے لئے پریشان کر دیا اور برصغیر کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ اسلامی ریاست کا نصب العین دے کر ان کی مردہ رگوں میں زندگی کی اک نئی لہر دوڑا دی۔

ادھر ہندو پریس اپنی پوری گمراہ کن قوتوں کے ساتھ پاکستان کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ کسی نے اسے دیوانے کا خواب کہا، کسی نے کہا کہ بھارت ماتا کی تقسیم اِک گناہ ہے۔ کسی نے کہا کہ اِک سیاسی چال ہے۔ کوئی اسے حکومت کے لئے اِک دھمکی سمجھتا۔ کسی نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں۔ لیکن ایک ہستی کو پورا یقین تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس کے سوا برصغیر کا کوئی دوسرا حل ہے ہی نہیں۔ عزم و استقلال کا وہ پیکر قائدِ اعظم محمد علی جناح تھا جو مخالفت کے ان طوفانوں

کو چیرتے ہوتے اپنے کارواں کو منزل مقصود کی طرف لیے جا رہے تھے۔

کتنی ہی مفاہمت کی گفتگوئیں ہوئیں۔ کتنے ہی مشن آتے اور گئے لیکن قائدِ اعظم کا جو موقف تھا وہ ایک تھا کہ برصغیر کے مسلمان کسی بھی تعریف کی رو سے ایک ہی قوم ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی دس کروڑ اشخاص کو اقلیت نہیں کہا جاتا۔ یورپ میں عیسائی بستے ہیں۔ ان کا ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب ہے پھر بھی وہ الگ الگ قومیں تصور ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی انگریز ہے کوئی جرمن کوئی فرانسیسی ہے کوئی پرتگیز۔ ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ مگر وہ سب پھر بھی الگ قوم اور علیحدہ علیحدہ وطن رکھتے ہیں۔ برصغیر کے دس کروڑ مسلمان جن کی تعداد ان سب سے زیادہ ہے۔ اپنے لیے اگر الگ وطن کا مطالبہ کریں تو اس میں گناہ کیا ہے۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں اور اپنا حق مانگنا جرم نہیں۔

وزارتی مشن نے بڑے دلفریب جال بچھائے۔ ویول نے بڑی دلکش پیش کش کی لیکن قائدِ اعظم نے ان کی ہر

چال کو ناکام بنا کے رکھ دیا۔ آخر مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کیا گیا۔ برصغیر بھر میں نئے الیکشن ہوئے جس میں مسلم لیگ نے ۹۹ ٪ نشستیں جیت لیں۔ مسلم لیگ کی اس بے پناہ مقبولیت سے انگریز اور کانگرس دونوں ہی بوکھلا اُٹھے۔

آخر قائدِ اعظم کی شبانہ روز کوششوں نے ہماری تمہاری تقدیروں کو بدل کے رکھ دیا اور بالآخر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے ابھری اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اس عظیم الشان اسلامی مملکت کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔
پاکستان کا قیام تاریخِ عالم کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ تمام عالم اسلام کی نظریں پاکستان پہ لگی ہوئی ہیں۔ یقیناً پاکستان دنیا میں اسلام کا سب سے بڑا حصار ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا کوئی انعام ہو سکتا ہے خدا کے اس عظیم انعام کی حفاظت اب ہمارا مقدس فرض ہے۔

مقدس فرمان

"خدائے عظیم و برتر کی قسم، جب تک دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانینگے۔ پاکستان کی حفاظت کیلئے میں تنہا لڑوں گا اور اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آئے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں، فضاؤں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔"

(قائدِ اعظم - محمد علی جناح)

پاک بھارت جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء

پاک بھارت جنگ نہ صرف برصغیر بلکہ تاریخِ اسلام میں ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ آزادی کے بعد دو خود مختار قوموں کے درمیان یہ بہت بڑے پیمانے پر زبردست مسلح تصادم تھا۔ اس جنگ کے اسباب کا کھوج لگانے کے لئے ہمیں سینکڑوں برس پیچھے کی تاریخ کو نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہ کفر و اسلام کی ٹکر تھی اور ابتداء ہی سے چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی برسرِ پیکار رہا ہے۔ یہ ہمارا دفاعی جہاد تھا اور اس جہاد کی داستان تو غزدۂ بدر سے لے کر جنگِ ستمبر تک پھیلی ہوئی ہے۔ تیرہ سو سال پہلے اللہ کی راہ میں جس جہاد کا آغاز ہوا تھا اس کی انتہا نہ جانے کہاں اور کب ہے۔ اور یہ

ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ہر میدان میں ایک دوسرے کے حریف رہے ہیں اور پھر حق بات تو یہ ہے کہ بھارت نے کبھی دل سے پاکستان کو قبول ہی نہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندو لیڈروں کے لیے مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا تو دیسی ریاستوں کے لئے یہ اصول طے ہوا کہ ریاست کے حاکم کو اختیار ہوگا کہ ہندوستان میں شامل ہو جائے۔ یا پاکستان میں یا خود مختار رہے۔ بھارت کا دانت حیدرآباد (دکن) پر تھا۔

اُس نے یہ رٹ لگائی کہ حیدر آباد کی آبادی چونکہ اسّی فیصدی ہندو ہے اس لیے حیدر آباد کو بھارت میں شامل ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو آبادی کو اپنے دعوے کی بنیاد بنایا۔ دوسری طرف اسی اصول سے منہ موڑ کر یہ کہنا شروع کیا کہ کشمیر کا حاکم چونکہ ہندو ہے اس لئے کشمیر کو بھارت میں شامل ہونا چاہیئے۔ خواہ وہاں کی ۹۰ ٪ آبادی مسلمان ہی کیوں نہ ہو اور پھر یہ دوہرا

اصول منوانے کے لئے فوجی طاقت کا استعمال کیا۔ کشمیر کے مہاراجہ نے بھارت سے ساز باز کرلی۔ اہلِ کشمیر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ چناروں کے اس دیس میں آگ لگ گئی۔ معاملہ یو۔ این۔ او تک گیا۔ کتنے ہی مشن آئے اور گئے۔ بھارت اپنے ہر وعدے سے پھر جاتا رہا۔ اہلِ کشمیر کے لیے ہر سُو مایوسی ہی مایوسی تھی۔ آخر اٹھارہ سال ظلم و تشدد کا شکار رہنے کے بعد اہلِ کشمیر کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ بھانپ گئے کہ سلامتی کونسل ایک خاموش تماشائی ہے اور پاکستان اپنی بعض مجبوریوں کے باعث کچھ کرنے سے قاصر ہے۔

انھوں نے اللہ کی رحمت کا سہارا لیا اور اگست ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں علم جہاد بلند کر دیا۔ ایک انقلابی کونسل بنائی۔ صدائے کشمیر ریڈیو وجود میں آیا۔ پاکستان نے ان کے اس اقدام کی تائید کی اور دنیا سے کہا کہ اخلاقی اعتبار سے اُن کا یہ اقدام بالکل درست اور صحیح ہے اور پاکستان کی پوری ہمدردیاں اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ بھارت اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو

رہا تھا۔ اُس نے اپنی بے پناہ قوت و طاقت کے مظاہرے کے لیئے آزاد کشمیر پر اندھا دھند حملہ کر دیا اور اس طرح اُس جنگ بندی لائن کو بھی توڑ دیا جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا اور پھر گجرات کی ایک نواحی بستی اعوان شریف پر گولہ باری کی جس سے کتنے ہی پاک شہری شہید ہو گئے۔ رن کچھ کی شکست کے بعد شاید وہ اب اپنا من پسند محاذ کھول رہے تھے۔ آخر بھارت کی من مانی کارروائیوں سے تنگ آکر پاکستانی افواج آزاد کشمیر کی فوجوں کی مدد کے لیئے پہنچیں اور بھارتی فوجوں کی چھمب میں خوب پٹائی ہوئی۔ چھمب سے نکل کر ۴ستمبر کو پاک فوج آزاد کشمیر دستوں کے ساتھ توی پار کر کے پانچ میل آگے بڑھ چکی تھی اور رات بھر میں بھارتی پہاڑی ڈویژن سے گھمسان کی جنگ لڑ کر دشوار گذار پہاڑی راستوں کو جہاں دور دور تک بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں صبح تک عبور کر گئیں اور جوڑیاں پر بھارت کی غیر معمولی قوت کو کچل کر بیشمار بھارتی سامانِ جنگ کے ساتھ بھارتی مرکز پر قابض ہو گئیں۔ بھارتی سورما سینکڑوں جنگی قیدی اور لاشیں

چھوڑ کر افراتفری میں جموں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پاکستانی فضائیہ نے اکھنور کے اہم فوجی اڈے تباہ کر دیئے۔ اور ۵ ستمبر کو پاکستانی فوج دریائے چناب کے کنارے اکھنور کے دروازے پر کھڑی تھی جہاں سے جموں صرف بارہ میل دُور ہے۔ بھارت نے جب دیکھا کہ کوئی دم میں جموں بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور ہندوستان کی جو پانچ ڈویژن فوج کشمیر میں ہے گھیرے میں آ جائے گی تو اُس کی جان ہی گویا تن سے نکل گئی۔ اب اس کے لئے کشمیر کے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا کہ پاکستان پر حملہ کر دے۔

متمدن اور مہذب قومیں جب ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں تو جنگ کے لیے پہلے باقاعدہ الٹی میٹم دیتی ہیں۔ سفارتی تعلقات توڑتی ہیں۔ باقاعدہ اور باضابطہ اعلانِ جنگ کرتی ہیں اور پھر کہیں جنگ کے طبل یا بگل بجتے ہیں۔ لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جو کچھ ہوا وہ بالکل اس کے الٹ تھا۔ یہ دن ہماری تاریخ میں ایک یادگار دن رہے گا۔ اس دن بغیر کسی رسمی اعلان کے بھارت کی بزدل فوجوں نے مہذب دنیا کے سب اصولوں کو

پسِ پشت ڈالتے ہوئے رات کے تین بجے لاہور پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں وہ ہماری سرحدوں کو عبور کر آئے اور سرحدی دیہاتی آبادیوں کو لوٹ مار کر کے اجاڑ دیا۔ بیشمار لوگ ان کی گولیوں سے شہید ہو گئے۔

آگ اور خون کے دریا اُبل پڑے۔ اک ہنگامۂ قیامت برپا ہو گیا۔ ہر سُو موت ہی موت تھی۔ جدید ترین مہلک ہتھیار ہوا میں لہرا رہے تھے۔ توپیں آگ اُگل رہی تھیں۔ فضا میں دھواں تھا یا شعلے تھے، اِدھر اُدھر سے بھی ہوا آگ ہی برسا رہی تھی۔ دشمن کے لاؤ لشکر کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ ایک ٹڈی دَل تھا کہ برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا ایک سیلاب تھا جو ہماری سرحدوں پر امڈا چلا آ رہا تھا۔

لاہور پر حملے کا اعلان کرتے ہوئے صدرِ پاکستان نے ریڈیو پاکستان پر گیارہ بجے اعلان کیا کہ بھارت نے بغیر کسی اعلانِ جنگ کے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ میں نے اپنی فوجوں کو مقابلے کا حکم دے دیا ہے اور ہماری باقاعدہ

جنگ شروع ہو چکی ہے۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ کے مقدس کلمات رچے بسے ہوتے ہیں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہو جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انھوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ پاکستانی عوام اپنے عقائد کی سر بلندی اور مقصد کی سچائی پہ پورا ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کے نام پہ ہم فردِ واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن سے لڑیں گے۔ انشاء اللہ حق کا بول بالا ہوگا۔

تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ اسلام کی تاریخ کے زریں کارنامے پاکستان کی شیر دل افواج نے اپنے خون سے لکھے۔ صدر پاکستان کا اعلان سنتے ہی پاکستانی فوجیں سرحدوں پہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ گئیں۔ پشاور سے لے کر چٹاگانگ تک بیس کروڑ ہاتھ اس بحر و بر کے مالک، زمین و آسمان کے قادرِ مطلق کے حضور میں فتح و نصرت کی دعاؤں کے لیے اٹھ

گئے۔ شیر دل سپاہی وطن کے ناموس کی حفاظت اور دس کروڑ عوام کی بقا کے لیے موت سے ٹکرا گئے۔ اُنھوں نے جنگ کے میدان کو صحنِ چمن سمجھا۔ اپنے خالقِ حقیقی کے احکام بجا لانے کے لیئے وہ میدان میں بے دھڑک کود پڑے۔ اس میں کسے کلام کہ قرونِ اولیٰ کی جنگوں کے بعد یہ سب سے بڑی اسلامی جنگ تھی۔ پاک فوجوں کی منزل، خوشنودیٔ خالق، رضائے الٰہی اور اپنے مقدس وطن کا دفاع تھی۔ یہ حق و باطل کا بہت بڑا معرکہ تھا۔ اس لیے پاک فوج نے اس راستے کے گرد و غبار کو بادِ صبا کے جھونکے سمجھا اور اس راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں کو ابدی راحتوں کا سرچشمہ سمجھا۔

پاکستانی مجاہدین اپنے وطن کی سرحدوں پر دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ اور باڑ کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ ان کی عقابی نگاہیں دشمن کی صفوں کو چیر گئیں۔ ان کے آہنی پنجے دشمن کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ ادھر پاکستانی فضائیہ کے شاہین آسمان کی وسعتوں کو ناپنے لگے۔ وہ بجلی کی مانند ہندوستانی ہوائی اڈوں پر کوندے۔ کبھی ہلواڑہ کے ہوائی اڈے

پر بجلی بن کر گرے ۔ کبھی سرینگر ، کبھی جودھ پور ، کبھی انبالہ کبھی امرتسر کی فوجی چھاؤنیوں پر وہ رعد کی طرح کڑکے اور آگ بن کر برسے ۔ پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف نے کہا تھا کہ میری مشکل یہ نہیں کہ میں اپنے ہوا بازوں کو میدانِ جنگ میں کیسے دھکیلوں بلکہ میری دشواری یہ ہے کہ انھیں بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے ؟

لاہور کے محاذ پر ناکام ہونے کے بعد تیسرے دن بھارت نے سیالکوٹ کے محاذ پر چھ سو (۶۰۰) ٹینکوں سے حملہ کر دیا ۔ ٹینکوں کی اتنی بڑی لڑائی دوسری جنگِ عظیم میں بھی نہ ہوئی تھی ۔ فولاد کا یہ سمندر بڑھتا چلا آ رہا تھا ۔ یہاں بھی تائیدِ آسمانی پاک افواج کے کام آئی ۔ بھارت کے ٹینک بہت بڑے تھے اور پاکستانی ٹینک چھوٹے لیکن یہ ممولے شہبازوں سے جا ٹکراتے اور ان کی آڑ میں پاکستانی جیالوں نے آگے بڑھ کر بھارتی ٹینکوں کے پہیوں میں دستی بم رکھ دیئے جس سے بھارتی ٹینکوں کے پرخچے اڑ گئے ۔ یہ جوش ، یہ ولولہ ، یہ ایمانی قوت صرف مجاہد ہی میں پائی جاتی ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اسلامی تاریخ کے زریں کارنامے ہماری آنکھوں کے سامنے دہرائے گئے۔ دشمن کے چھ سو ۶۰۰ ٹینک بھی ڈھول کے انبار ثابت ہوئے۔ ہمارا ایک ہوا باز عالم اڑتا ہے اور بھارت کے گیارہ طیارے گرا کر سلامتی سے واپس لوٹ آتا ہے۔ ادھر ہمارا ایک اور ہوا باز یونس حسن شہید دشمن کی سرزمین میں جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے طیارے کو نقصان پہنچ گیا ہے تو اپنی جان بچانے کے لیے واپس آنے کی بجائے وہ دشمن کے ہوائی اڈے کا رُخ کرتا ہے اور اپنے طیارے کو دشمن کے طیاروں سے جا ٹکراتا ہے اور اس طرح وہاں کھڑی صف کی صف کا صفایا کر دیتا ہے۔ میجر خادم حسین دیکھتا ہے کہ ایک ٹینک شکن توپچی کا سر دشمن کی گولی سے اڑ گیا ہے اور توپ خاموش ہے۔ ادھر دشمن کے ٹینک بڑھے چلے آ رہے

ہیں تو خود مورچے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ موت یقینی ہے۔ مگر وہ ایک ٹینک کو توڑتا ہے، دوسرے کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ تیسرا آتا ہے اور اُسے کچلتا ہوا نکل جاتا ہے۔ موت کا یوں استقبال کرنے والے کچھ اسلام ہی کے سپوت ہو سکتے ہیں۔ بھارت کو ایسے جانباز کہاں نصیب؟ ایک دنیا نے دیکھا کہ کس طرح پاک افواج کے بازوؤں کو خدا نے قوتِ حیدری بخش دی۔ ان کے دلوں میں سوزِ صدیقؓ، جذبۂ فاروقیؓ اور خلوصِ عثمانیؓ بھر دیا۔ وہ اپنی سرحدوں پر بڑھنے والے قدموں کے لیے پیغام اجل بن گئے۔ دشمن جو اس سرزمین پر فتوحات اور عیش و عشرت کے خواب دیکھنے آیا تھا۔ یہ علاقے، یہ گاؤں یہ قصبے اُس کے ارادوں کا قبرستان بن گئے۔ دشمن کے ناپاک ارادے، ناجائز طریقوں سے ہتھیاتے ہوئے ہتھیار پاک سرحدوں پر بکھرے پڑے تھے۔ کہیں چونڈہ میں بھارتی ٹینکوں کا قبرستان ہے تو کہیں بھارتی ہوائی جہازوں کا مرگھٹ اور وہ اپنے مالکوں کی نوحہ خوانی کر رہے ہیں۔ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء زحمت کے پردے میں رحمت بن کر آئی۔

پاکستانی قوم نے اپنے معرکوں سے اسلاف کے ان کارناموں کو پھر تازہ کر دیا جن کی یاد سے تاریخ کے اوراق اور ہمارے سینے منور ہیں۔ راکٹوں اور میزائلوں کے اس ایٹمی دور میں بھی خدا اور رسولؐ کے نام لیواؤں نے یہ ثابت کر دیا کہ سچائی کی قوت اور ایمان کی حرارت کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی سرنگوں ہے۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے سترہ دن، سترہ پل تھے۔ آئے اور گذر گئے لیکن ان سترہ دنوں نے قوم کے چہروں پر سے جمی ہوئی وقت کی گرد کو دھو ڈالا۔ قوم کے زنگ کو دھو ڈالا، ضمیر کے آئینے صاف کر دیئے۔ لڑائی سے پہلے ملک میں بے شمار برائیاں پروان چڑھ رہی تھیں لیکن اس سترہ روزہ جنگ نے ہمارے اندر قومی یک جہتی، حب الوطنی ایثار اور خلوص کا ایک انوکھا جذبہ بیدار کر دیا۔ ادھر سماجی برائیاں زمین کے اندر گہری دفن ہوگئیں۔ آپس کے اختلافات دور ہوگئے۔ ہر شخص اور ہر جماعت نے اپنے آپ کو پہچان لیا اور اپنے گم شدہ راز کو پا لیا۔ لوگوں کا زاویۂ نظر اور اندازِ فکر ہی بدل گیا۔ لوگوں کے جذبے

کا یہ حال تھا کہ توپوں کی دھنا دھن اور طیاروں کی گھناگھن کے باوجود بھی لاہور چہکتا تھا۔ لوگوں نے اس طرح محسوس کیا جیسے سرحدوں پر میچ کھیلے جا رہے ہیں۔ سارا پاکستان ایک دم متحد اور منظم ہو گیا۔ ساری قوم ایک ہو گئی۔ مشرق و مغرب کے ہزاروں میلوں کے فاصلے سمٹ گئے اور مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے۔

؎ مشرق و مغرب پکارے ایک ساتھ
دل دھڑک اٹھے ہمارے ایک ساتھ

سبھی پاکستان کی بقا اور تحفظِ ناموس کے لیے ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ہاتھ اُٹھے تو ایک ساتھ زبانیں کھلیں تو ایک ساتھ۔ عوام کے بازو ملک کے بازو ہو گئے۔ ہمیں اس جنگ سے ایک ایسا موقع مل گیا جس سے ہم نے اپنی خفیہ صلاحیتوں اور گم گشتہ عظمتوں کا نشان پا لیا۔ اپنی قومی یگانگت اور اسلامی سطوت کے اظہار کا موقع ملا۔ ہمارے دلوں میں اپنی قلیل نفری اور دشمن کی کثرت کے جو چھوٹے وسوسے اور خدشے تھے، وہ سب مٹ گئے۔ یہ جنگ ایسی بھٹی تھی جس میں پاکستان کو سونے کی

طرح پرکھا گیا۔ وہ کندن کھرا نکلا۔ پاکستان اور بھی مضبوط اور مستحکم ہوا اور قوم زیادہ سر بلند ہوئی۔ ان سترہ دنوں نے ہمارے اسلاف کی عظمتوں کی قسم کھائی۔ اس عہد کے جیالوں کی سر بلندی کا اعتراف کیا اور آنے والی نسلوں کی سرخروئی کا پیمانِ وفا باندھا۔

ہماری فضائیہ نے جنگی اخلاق کے مطابق بھارت کے صرف فوجی ٹھکانوں اور ہوائی اڈوں پر بمباری کی۔ لیکن بھارت تو بوکھلا اٹھا تھا کسی فوجی اڈے یا ہوائی اڈے پر تو بم نہ گرا سکا البتہ شہری آبادی کو نشانہ بنایا۔ پاکستانی فوج کس قدر نڈر، دلیر، جری، تربیت یافتہ، جاں نثار اور جان باز ہے۔ جب ہر محاذ پہ ہماری فوج نے دانت کھٹے کر دیئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حملہ آور نے پھر خود ہی سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ہر طرف سے صلح و آشتی کی صدائیں گونجنے لگیں۔ حتیٰ کہ سلامتی کونسل کے بیچ بچاؤ سے ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔

اپنی ساری طاقت میدانِ جنگ میں جھونک دینے کے باوجود بھارتی سورما ایک انچ آگے نہ بڑھ سکے۔

ان کے کتنے ہزار سپاہیوں کا صفایا ہو گیا ۔ ان کی بکتر بند فوج کی کمر چونڈہ کے میدانِ جنگ میں ٹوٹ گئی ۔ ان کی ہوائی طاقت کو زبردست دھکا لگا ۔ سینکڑوں ہوائی جہاز تباہ ہو گئے ۔ ان کی بحری فوج نے گھٹنے ٹیک دیئے ۔ دوارکا کا راڈر پاک بحریہ نے تباہ کر کے رکھ دیا ۔ اب اگر بھارتی حکمران صلح کا دروازہ نہ کھٹکھٹاتے تو کیا کرتے ۔

گویا ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء عہد حاضر کی تاریخ میں ایک نشانِ راہ کی حیثیت سے ابھرا ۔ یہ تاریخ پاکستان کا بالخصوص اور تاریخ اسلام کا بالعموم ایک زریں ورق ہے ۔ وہ دنیاوی دماغ جو فتح و شکست کے اندازے مادی وسائل کے پیمانوں سے لگانے کے خوگر تھے ، انگشت بدندان رہ گئے ۔ کیونکہ روس امریکہ اور فرانس کے فولاد اور بارود میں ڈھلا ہوا بھارتی بھوت پاکستان کو ہڑپ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاؤں زخمی ہو گئے ۔ بازو کٹ گئے اور ناک اڑ گئی ۔ ننھے منے پاکستان نے اپنے سے پانچ گنا طاقتور دشمن کے جسم میں دانت گاڑ دیئے تھے ۔ سامراجیوں کے اندازے غلط نکلے اور ایک دفعہ یہ حقیقت

پھر دُنیا کی آنکھوں کے سامنے یہ حقیقت بھی آگئی کہ ہار جیت کا انحصار سامانِ جنگ یا فوجوں کی کثرت و قلت پر نہیں بلکہ اس کا دارو مدار جذبۂ ایمان اور سپرٹ پر ہوتا ہے اور اکثر تھوڑی جماعت زیادہ آدمیوں پر غالب آجاتی ہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ عقیدے اور ایمان کی حرارت نے فولاد کو پگھلا ڈالا اور جب عشق آگ میں کودا تو وہ آگ بے اثر ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے جو مہیب بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے تاشقند کی ہوا ان بادلوں کو اڑا کر لے گئی۔ لیکن اس حقیقت کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے دشمن سے ہے جو کسی عہد و پیمان اور اصول و آئین کا پابند نہیں۔ اس کا ماضی پکار پکار کر گواہی دے رہا ہے کہ معاہدے کرنا، ان کا توڑنا اور ان کی پھر غلط تاویلیں کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے لہذا ہمیں اپنے جذبۂ جہاد کو ہمیشہ بیدار رکھنا چاہیے اور اپنے دفاع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ گذشتہ جنگ میں ہمیں دشمن کے مقابلے میں جو حیرت انگیز کامیابی

نصیب ہوتی ہے اس میں تائیدِ آسمانی کو سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ اس لیے اپنے خالقِ حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہیے۔ یہ تعلق جتنا گہرا ہوگا اتنے ہی ہم خدا کی رحمت و نصرت کے زیادہ مستحق ہوں گے اور اسی نسبت سے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہوتے چلے جائیں گے۔

وارثانِ
نشانِ حیدرؑ

نشانِ حیدر

بچو! پاکستانی فوج کا سب سے بڑا اعزاز "نشان حیدر" اسلام کے قابل فخر اور فتح نصیب جرنیل و سپاہی حیدر کرار حضرت علیؓ کے نام نامی سے منسوب ہے۔ اب اس ذات گرامی کی نسبت سے اس نشان پانے والوں کی خوش بختی کا اندازہ خود لگائیے۔ اس مقدس مناسبت سے ان کے نام شجاعت و مردانگی کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔

نشان حیدر پانچ کونوں والا ایک ستارہ ہوتا ہے جس میں ہلال اور ستارہ ہیرے کا ہوتا ہے، جس کے اوپر والی پٹی پر جلی حروف میں نشان حیدر کندہ ہوتا ہے۔ اس ستارے کی پشت پر اس بہادر جانباز

کا نام ، اس کے یونٹ کا نام ، جائے شہادت اور تاریخِ شہادت درج ہوتی ہے ۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک صرف چار خوش نصیبوں نے یہ مقدس نشان حاصل کیا ہے اور سبھی نے اپنی جان کی بازی لگا کر یہ اعزاز پایا۔ ان کے نام نامی یہ ہیں :

۱ ۔ کیپٹن راجہ محمد سرور شہید
۲۷ر جولائی ۱۹۴۸ء

۲ ۔ میجر چوہدری طفیل محمد شہید
۷ر اگست ۱۹۵۸

۳ ۔ میجر راجہ عزیز بھٹی شہید
۱۲ر ستمبر ۱۹۶۵

۴ ۔ راشد منہاس شہید
۲۰ر اگست ۱۹۷۱

کیپٹن سرور شہید

یہ داستان ہے پاکستان کے اس جیالے سپوت کی جس نے ۱۹۴۸ میں کشمیر کے محاذ پر بھارت سے لڑتے اور لاثانی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا اور سب سے پہلے پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز نشان حیدر حاصل کیا۔

۱۹۴۸ میں جب کشمیر جل رہا تھا نوجوان کیپٹن سرور جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں سگنل کورس کی تربیت لے رہے تھے۔ انہی دنوں میں آپ کی رجمنٹ کو دشمن کے مقابلہ کے لیئے "اوڑی" کے محاذ پہ جانے کے احکام ملے۔ کیپٹن سرور کے دل میں جذبہ شہادت نے انگڑائی لی۔ اپنی رجمنٹ کے ساتھ جانا چاہتے

تھے، مگر ہنوز کورس کی تکمیل باقی تھی۔ جونہی کورس کا بقیہ حصّہ پورا ہوا۔ آپ نے اپنی یونٹ میں شامل ہونے کی درخواست دی مگر نا منظور ہوئی۔ آپ مایوس نہیں ہوئے بلکہ جی کڑا کر کے اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور کہا کہ میری یہ دلی تمنا ہے کہ میں بھی چناروں کے اس دیش میں دشمن سے دو دو ہاتھ کروں اور اپنے کشمیری بھائیوں کو بھارتی عفریت کے ظلم و ستم کے پنجہ سے نجات دلاؤں۔ جوان سال کیپٹن نے اپنی تمنا کا اظہار کچھ ایسے انداز میں کیا کہ آفیسر انچارج اسے رد نہ کر سکا۔ آپ کو اجازت مل گئی۔ آپ کے چہرے پہ تشکر اور مسرت کی اک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

فوراً اپنے انسٹرکٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے جس سے انھیں والہانہ عقیدت تھی اور کہا کہ "اے میرے محترم استاد! مجھ سے اگر گزشتہ ٹریننگ کے دوران کسی قسم کی کوئی لغزش یا غلطی سر زد ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ میں دل میں شوق شہادت

لیے کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہوں - میری دلی تمنا کا ایک حصہ بر آیا ہے - دعا کریں خدا مجھے شہادت نصیب کرے، جو ایک مجاہد کا معراج ہے، استاد کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، نہائیت شفقت سے خدا حافظ کہا۔

رمضان کا مبارک مہینہ تھا - دو دن کی رخصت لے کر گھر آئے، عزیز و اقربا سے ملے اور پھر سب سے رخصت ہو کر محاذ کا رخ کیا جہاں آپ کو سگنل افسر مقرر کیا گیا - ۱۹۴۸ کے جولائی کی ستائیس تاریخ تھی - آج کیپٹن شہید کو اپنی کمپنی کے ساتھ محاذ کی طرف بڑھنا تھا - اوڑی کے محاذ پر دشمن توپوں اور مشین گنوں سے لیس تھا - اتنی سنگین گولہ باری میں پاک فوج کے لیئے آگے بڑھنا دشوار تھا - آفیسر کمانڈنگ نے گرجدار لہجے میں کہا کہ کمپنی کی کمان کے لیئے ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ صرف اس آدمی کو کمان سونپی جائے گی جو یہ ذمہ داری لے کہ وہ دشمن کی توپوں کو ہمیشہ کے لیئے خاموش کر دے گا - یہ الفاظ

شہید کیپٹن کے دل میں تیر کی طرح گڑ گئے اور اس
کے خفتہ جذبات درد کے لیئے بانگ سحر کا کام کر
گئے ۔ اس کے شوق شہادت نے انگڑائی لی اور وہ
بے اختیار قدم آگے بڑھ کر کہنے لگے ۔ اس
سعادت کا میں ذمہ لیتا ہوں ۔ آفیسر کمانڈنگ نے
سر سے لے کر پاؤں تک جوان سال کیپٹن کا جائزہ
لیا ۔ اس کے چہرے پہ عزم و استقلال کی ایک جھلک
تھی ۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی ۔ گویا ایمانی حرارت
کے تمام ولولے اس ایک شخصیت میں سمٹ آئے تھے ۔
کمپنی کی کمان سنبھالی ۔ رات کے پچھلے پہر سحری کھا
کر دوگانہ ادا کیا اور دشمن کا رخ کیا ۔ جوں جوں آگے
بڑھ رہے تھے دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ بڑھتی جا
رہی تھی ۔ جب پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تو دشمن اور
بھی چوکنا ہو گیا ۔ اب اس کی اندھا دھند فائرنگ سے
آگے بڑھنا محال تھا ۔ بڑا ہی نازک موقع تھا ۔ ذرا
سی لغزش یا بزدلی سے سبھی کا کام ایک لمحہ میں
تمام ہو جاتا لیکن نوجوان سالار تو کل رات اس سارے

محاذ کا رات کی تاریکی میں جائزہ لے گیا تھا۔ اب خود اپنے ہراول دستے کی قیادت شروع کی تاکہ نوجوانوں کے حوصلے بلند رہیں۔ نصف راہ اور طے کر لی تو دیکھا کہ معاملہ رات سے کچھ مختلف ہے۔ دشمن نے اپنے مورچوں کو خاردار تاروں کے جال سے بن رکھا ہے۔ یہ بار پچھلی رات نہ تھی۔

کیپٹن سرور بھاٹی راہ کو پُر خار دیکھ کر اور بھی خوش ہوا۔ اپنے دوسرے ٹرپی کو آگے بڑھایا اور دونوں مشین گنوں کو فائر کا حکم دے دیا۔ وہ خود اس وقت جہاد کے شوق میں کچھ ایسے مسرور اور شہادت کے نشہ میں کچھ ایسے مخمور تھے کہ بجلی کی سی تیزی سے ہر سمت کوند رہے تھے۔ ان کے ایمانی جذبے نے ساتھیوں کے دلوں کو اور بھی گرمایا اور یہ مٹھی بھر مجاہدین کفر کے سامنے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ گئے۔

ادھر اور ادھر دونوں طرف سے آگ ہی آگ برس رہی ہے۔ فولادی گولے آ رہے ہیں۔ اچانک

دشمن کی ایک گولی پاک فوج کے توپچی جس کا نام فرمان علی تھا لگتی ہے اور وہ شہید ہو جاتا ہے اب مشین بیکار ہے لیکن کیپٹن سرور نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جست لگائی اور مشین گن خود سنبھال لی ۔ دشمن پر جوابی فائرنگ جاری رکھی ۔ دشمن کے درجنوں اور بیسیوں سپاہیوں کو جہنم کی راہ دکھائی اور ساتھ ساتھ اپنے جوانوں کو للکارتے رہے کہ اسلام کے شیرو! پاکستان کی آبرو کا سوال ہے آگے بڑھو اب منزل سامنے ہے اور کوئی دم کی بات ہے کہ پاک پرچم وہاں لہراتا ہو گا ۔

دشمن کی فائرنگ اور تیز ہو جاتی ہے ۔ اچانک ایک گولی کیپٹن سرور کے دائیں کندھے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے لیکن وہ تو زندگی اور موت سے بے نیاز تھے ۔ مرہم پٹی کا بھی وقت نہ تھا ۔ ایک لمحے کی غفلت سے بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا ۔ اس سے دشمن کو قدم جمانے کا موقع مل جاتا اور یوں جیتی ہوئی بازی ہار جانے کا اندیشہ تھا ۔ آپ کو

اپنا وعدہ خوب یاد تھا کہ میں نے دشمن کی توپوں کو خاموش کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ جب تک ان کے دہانے ہمیشہ کے لئے بند نہ ہوں گے اس پہاڑی پر قبضہ نہ ہو سکے گا۔

وہ ہر ممکن جنگی چال چل رہے تھے اور آہستہ آہستہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک اور گولی آئی اور ان کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ لیکن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دینے والے مجاہد نے ساتھیوں کو للکارا کہ دوستو! تم مسلمان ہو اور شہادت مومن کے لئے معراج کی حیثیت رکھتی ہے آگے بڑھو، شہید بنو یا غازی۔ دیکھو دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ اپنی کوششیں تیز تر کر دو اور اسے مہلت نہ دو۔ جوانوں کے حوصلے اور بڑھے۔ فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی۔ اللہ کے شیر آگے بڑھتے ہیں۔ ادھر سالار کی یہ حالت کہ زخموں سے مسلسل خون بہتا جا رہا ہے۔ اسی پر انسانی زندگی کا دارو مدار ہوتا ہے۔ وہ خون میں لت پت تھے۔ جسم زخموں سے چھلنی تھا

مگر حوصلہ بلند اور شہادت کی تمنّا تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ۔ ادھر سے اپنے سپاہی بڑھتے آ رہے تھے اپنا دوسرا توپچی بھی قریب آ گیا تو سب مل کر ان خاردار تاروں کو کاٹنے کے لیئے دیوانہ وار آگے بڑھے کیونکہ اس کے بغیر آگے بڑھنا دشوار تھا ۔ ایمانی حرارت سے فولاد پگھل جاتا ہے ، تاریں کٹ گئیں راستے سے رکاوٹیں ہٹ گئیں ۔ پاک فوج کے جوان اب پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے ۔ فتح اب چند لمحوں کی بات تھی ۔ مگر دشمن کی آٹو میٹک مشین گن کے ایک فائر نے کیپٹن سرور کا سینہ چھلنی کر دیا ۔ ان کی دلی تمنا بر آئی ۔ خدا نے انھیں شہادت کی سعادت نصیب کی ۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں فرمایا جوانو! میرا فرض ادا ہو گیا ۔ اب آگے بڑھ کر پہاڑی پر سبز ہلالی پرچم لہرانا تمھارا فرض ہے ، یہ کہہ کر وہ ابدی نیند سو گئے

سو گیا کہہ کے کارکن کام تمام ہو گیا

تھوڑی دیر بعد پہاڑی پر پاک فوج کا قبضہ تھا ۔

اور چاند تارے والا سبز پرچم اس کی چوٹی پہ لہرا رہا تھا اور جوان اپنے جواں سال کیپٹن کی شہادت پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کر رہے تھے۔

کیپٹن سرور شہید نے ۲۷ر نومبر ۱۹۴۸ کو شہادت پائی اور آپ کو اسی محاذ پہ تل، پترا پہاڑی پر دفن کیا گیا۔

ع بجھ کر بھی جل رہا ہے وہ ایسا چراغ ہے
سرور شہید راہِ وفا کا سراغ ہے

میجر محمد اکرم شہید

(نشانِ حیدر)

میجر محمد اکرم شہید ہماری قومی اور عسکری تاریخ کے وہ پانچویں خوش بخت انسان ہیں جنھیں ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز (نشانِ حیدر) عطا ہوا۔

پاکستان کے اس مایہ ناز فرزند اور جیالے سپاہی نے ۴ر اپریل ۱۹۳۸ء کو گجرات کے مشہور قصبہ ڈنگہ میں اپنے ننہال کے ہاں آنکھ کھولی۔ ان کی پیدائش گو ڈنگہ میں ہوئی مگر اُن کا اصل گاؤں "نکہ کلاں" تھا جو ضلع جہلم میں واقع ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی دوسری اولاد تھے۔ ان کے والد کا نام سخی محمد تھا۔ باپ اور دادا سب فوج میں ملازم چلے آ رہے تھے۔ ان کے تایا اور سگے بھائی بھی

فوج میں چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ میجر اکرم شہید کے دو سگے بھائی مشرقی پاکستان میں وطن عزیز کا دفاع کر رہے تھے۔ جنگ بندی کے بعد ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ وہ ایک گمنام سپاہی کی حیثیت سے میدان میں کام آئے۔

اکرم شہید نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی۔ نویں جماعت کے بعد ملٹری کالج جہلم میں داخلہ لے لیا اور پھر باقی تعلیم انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی میں پوری کی۔ شروع میں کمیشن حاصل کرنے کی کوشش ضرور کی مگر ناکام رہے اور ۱۹۵۱ میں بطور بوائے ریکروٹ ہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دو سال کی فوجی ٹریننگ کے بعد وہ پنجاب رجمنٹ میں شامل ہو گئے جہاں یکے بعد دیگرے آپ نے کئی فوجی امتحانات پاس کئے اور لانس نائک کا عہدہ مل گیا اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے۔ بالآخر انھیں باقاعدہ کمیشن کے لئے چن لیا گیا۔ کاکول اکیڈیمی میں اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھیں کیڈٹ سارجنٹ کا عہدہ دیا گیا۔ پلاٹون

کمانڈر نے اکرم شہید کی شاندار کارکردگی پر ان کی رپورٹ میں لکھا کہ یہ نوجوان ایک نہ ایک دن لڑائی میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں انھیں کمیشن ملا اور سیکنڈ لیفٹننٹ کی حیثیت سے انھیں چوتھی فرنٹیر فورس سے وابستہ کر دیا گیا۔ یہ فورس اپنی صد سالہ فوجی روایات کے لیے مشہور ہے۔ ترقی کرتے کرتے یہ ہونہار نوجوان میجر کے عہدہ تک جا پہنچا۔

مشرقی پاکستان میں جب حالات نے پانسہ پلٹا تو ملکی دفاع کی خاطر فرنٹیر فورس کے ہمراہ یہ بھی ادھر پہنچے۔ اس جیالے نوجوان کو ادھر "ہلی" کے علاقہ پر متعین کیا گیا۔ ہلی ریلوے سٹیشن کے سامنے والے علاقے کا دفاع جن خوش نصیبوں کے سپرد تھا، ان میں میجر اکرم شہید کی کمپنی بھی شامل تھی۔ یہ بڑا اہم محاذ تھا۔ راج شاہی کے اس لمبے چوڑے محاذ پر مختلف بریگیڈوں سے تعلق رکھنے والی کل تین ٹبالین فوج اپنے مورچوں پر ڈٹی ہوئی دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کر رہی تھی۔ ادھر دشمن ہر لحظہ تازہ دم کمک لا رہا تھا۔ میجر اکرم شہید کی کمپنی ایک

نہایت اہم پوزیشن میں تھی جو دشمن کے مقابلے میں ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتی تھی۔

ہلی کا یہ محاذ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے بہت اہم تھا لہٰذا ہلی پر دشمن کا دباؤ ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دشمن تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ مگر اسے ہر دفعہ منہ کی کھا کر پیچھے ہٹنا پڑتا۔ انفنٹری کی مدد کے لیے بیشمار بکتر بند گاڑیوں کو میدان جنگ میں جھونکنے کے بعد دشمن ناکام رہا۔ ہر مرتبہ فرنٹیئر فورس کے جری بہادر اور جانباز سپوت اسے پیچھے دھکیل دیتے۔ میجر اکرم شہید کی کمپنی اس سلسلے میں بہت اہم کارنامے انجام دے رہی تھی۔ چونکہ وہ ایک نہایت اہم پوزیشن میں تھے۔ اس لیے ہر مرتبہ دشمن پر کاری ضرب لگاتے. اور اسے بُری طرح کچل کر رکھ دیتے۔

ادھر بھارت سے ہر لحظہ تازہ دم کمک اور نئے ہتھیار اور جنگی سامان اس محاذ پر پہنچ رہا تھا۔ ادھر پاکستانیوں کے لئے ہوائی، سمندری اور زمینی سب راستے بند تھے۔ بھارت کو اس کمزوری کا پوری طرح احساس تھا۔ تنگ آکر

دشمن نے اب اس علاقے پر ٹڈی دل لشکر اور ان گنت بکتر بند گاڑیوں سے بہت بڑا حملہ کر دیا۔ پاک فوج کے پاس لے دے کے گنتی کی چند بکتر بند گاڑیاں تھیں، جو یقیناً اس لاؤ لشکر اور سازو سامان کے سامنے اپنی پیدل فوج کا ہاتھ نہ بٹا سکتی تھیں۔ جس روز ہلی کے محاذ پر یہ تاریخی معرکہ برپا ہوا، اس روز پاک پیدل فوج اپنی بکتر بند گاڑیوں کی کمک سے بالکل محروم رہی۔ دشمن نے میجر اکرم شہید کی کمپنی پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ دشمن کے ٹینک آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف آگ اور بارود کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دور دور تک آگ اور دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مگر پاک فوج کے من چلے اور جیالے سپاہی بڑے اطمینان کے ساتھ ساری صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر اک سکون برس رہا تھا۔ وہ نہ دشمن سے ڈرتے تھے اور نہ موت سے۔ وہ چھ ماہ سے اسی محاذ پر ڈٹ کر لڑ رہے تھے مگر گزشتہ دو ہفتوں سے دشمن کا شدید دباؤ برداشت کر رہے تھے۔ اب ان کے کئی ساتھی بھی ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے تھے۔ اب تو کمپنی کی

بجائے لے دے کے دو پلاٹون ہی باقی رہ گئے تھے۔ لہذا کمپنی کمانڈر میجر اکرم شہید نے یہی فیصلہ کیا کہ اب دشمن کو آگے آنے ہی دیا جائے اور پھر اس سے دو دو ہاتھ کئے جائیں۔

دشمن اپنی گنتی اور سامان جنگ کی فراوانی کے نشے میں مست آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹینک آگ کے گولے برسا رہے تھے۔ ادھر پاک مورچے بالکل خاموش تھے۔ دشمن نے سمجھا کہ مٹھی بھر پاکستانی سپاہیوں کا کام تمام ہو چکا ہے یا وہ میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ میجر اکرم شہید کا فیصلہ نہایت درست تھا۔ ان کے پاس جو تھوڑا بہت ٹینک شکن سامان موجود تھا اس سے اگر دشمن کے حملے کو روکنے کی کوشش کی تو دشمن بڑی آسانی سے ان چند جوانوں کو فائر کر کے کچل دیتا۔ میجر اکرم شہید نے انھیں بلا روک ٹوک آگے بڑھنے دیا اور جب وہ سو گز تک ان کے قریب آ گئے تو اپنی کمپنی کے بچے کھچے جوانوں کو چھوٹے ہتھیاروں سے بھارتی فوج پر حملے کا حکم دیا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور پاک فوج کے یہ جیالے سپاہی

رتی سینا پر ٹوٹ پڑے - اپنے چھوٹے موٹے ٹینک
ن ہتھیاروں سے ٹینکوں پر بھی دھاوا بول دیا - دشمن
ھلا اٹھا - وہ تو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھا تھا - دست بدست
ائی ہوئی - دشمن اپنی ان گنت لاشیں اور بکتر بند گاڑیاں
ے انجر پنجر چھوڑ کر بھاگ نکلا - اس فتح کا سہرا محض اس
جوان میجر کی بے مثال قیادت کے سر تھا -

دشمن نے فرار کی راہ لی ، پاکستان کا پرچم ہلی پہ لہراتا
ہا لیکن اس تاریخی معرکہ میں میجر اکرم خود داد شجاعت دیتے
ہوئے شہید ہو گئے - انا للہ و انا الیہ راجعون -

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگ پور مرتضٰے چیزی دگر

حکومت پاکستان نے ان کی بے مثال جرأت اور قیادت
کے اعتراف کے طور پر انھیں نشان حیدر کا اعزاز دیا جو
ہمیں ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ ۱۹۷۱ء کے معرکہ میں میجر
اکرم شہید ہماری ایمانی جراٗتوں کی نشانی تھا - یہ نشانی ایک
ایسی شمع ہے جسے شہید نے اپنے خون سے روشن کیا - یہی
شمع آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی

اور اسی شمع کی روشنی میں ہماری نسلیں اپنے اسلاف
شاندار روایات کی داستانیں پڑھ سکیں گی۔

حق بات تو یہ ہے کہ ہلی کے محاذ پر ارض پاکستا
کا دفاع کرتے ہوئے میجر اکرم شہید نے جرأت ، شجاعت
بہادری ، قیادت اور جوانمردی کی جو مثال قائم کی ہے ا
سے نہ صرف پاکستانیوں کے سر فخر سے بلند ہو جائیں
بلکہ تاریخ حرب کے ماہر بھی انگشت بدنداں ہو کر
جائیں گے ۔

سوار محمد حسین شہید

(نشان حیدر)

بچو! پیارے پاکستان کی قومی اور فوجی تاریخ میں سوار محمد حسین شہید کا نام ہمیشہ یاد رہے گا جس نے ۱۹۷۱ کے معرکۂ حق و باطل میں شکر گڑھ کے محاذ پر بے مثال شجاعت کے لازوال کارنامے سر انجام دیئے اور اپنی بے مثال جرأت، فرض شناسی اور قربانی کے صلے میں پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز حاصل کرنے کی سعادت پائی۔

سوار محمد حسین شہید بر صغیر کے بٹوارے کے دوران میں تحصیل گوجر خان کے ایک دور افتادہ گاؤں "موہڑہ حیات" میں پیدا ہوئے۔ ... ایک غریب گھرانے کے چشم و

چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام روز علی تھا جس
سوار شہید کی لاش کے سرہانے کھڑے عوام کو بتایا
ان کے باپ نے انھیں اور ان کے دوسرے بھائیوں
راولپنڈی میں گھاس بیچ کر پالا۔ باپ نے جب ہمیں جدائی
کا داغ دیا تو بڑے بھائی نے درانتی سنبھالی اور باپ
کے نقشِ قدم پر چل کر میری پرورش کی۔ جن دنوں میری
شادی ہوئی ہمارا اثاثہ گھاس کے خشک ڈھیروں کے سوا
اور کچھ نہ تھا۔ خدا نے مجھے بہت سے بچے دیئے لیکن
محمد حسین شہید اور ایک لڑکی کے سوا باقی سب اللہ کو
پیارے ہو گئے۔ میں نے بھی آبائی پیشہ ہی اختیار کیا
اور زمین کا سینہ کرید کرید کر گھاس کے سبز اور خشک
تنکوں میں روزی تلاش کی اور اسی رزق حلال سے اس
شہیدِ وطن کو پالا پوسا۔ میں نے اسے تعلیم کے لئے ڈسٹرکٹ
بورڈ ہائی سکول دولی میں داخل کرایا، جہاں اس نے
میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان وہ پاس نہ کر
سکا لیکن پھر سکول کا رُخ کرنے کی بجائے اس نے
ایک دن جاتلی کے ڈاک بنگلے کا رُخ کیا، جہاں فوجی بھرتی

کے سلسلے میں ریکروٹنگ افسر آئے ہوئے تھے ۔

بھرتی ہونے والوں کا اک ہجوم تھا مگر اس دن صرف دو آدمیوں پر ان کی نگاہ انتخاب پڑی ۔ ایک نورِ چشم شہید پر اور دوسرے اسی کے ایک دوست پر جس کا نام دلپذیر تھا ۔ وہ دن اس کی آرزوؤں کی تکمیل کا دن تھا کیونکہ یہی اس کی منزل تھی ۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ۔

سوار شہید نے ابتدائی تربیت نوشہرہ میں حاصل کی اور پھر ایک ڈرائیور کی حیثیت سے ۲۰ لانسر میں متعین ہوئے اور اس کے بعد اپنی مختصر سی ملازمت کی ساری مدت سیالکوٹ کے علاقہ ہی میں گزار دی ۔

۱۹۶۷ء میں محمد حسین شہید کی شادی اپنے خاندان ہی میں خالہ زاد بہن سے ہوئی ۔ خدا نے اگلے سال انھیں ایک بیٹی عطا کی اور پھر ایک بیٹا ۔ افسوس کہ بیٹا ان کی شہادت کے کوئی تین ماہ بعد پیدا ہوا ۔ نہ بیٹا اپنے نامور باپ کو دیکھ سکا اور نہ ہی شہید کو اپنے اکلوتے بیٹے کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ۔

بچپن ہی سے سوار شہید کے دل میں اسلام اور اپنے

پیارے وطن پاکستان کے لیئے اتھاہ محبت تھی - ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں جب وہ ابھی فوج میں نہ گئے تھے وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ کھیتوں میں کھڑے ہو کر پاک فضائیہ کے شاہینوں کو گھنٹوں تک دیکھتے رہتے اور جب کوئی جہاز سر پر سے گزرتا تو بڑے جوش و خروش سے نعرہ تکبیر لگاتے اور بڑے ادب و احترام سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر پاک فوج کو سلام کرتے۔

اب ۱۹۷۱ء کا معرکہ گرم ہوا تو سوار شہید خود فوج میں موجود تھے - اب ان کا جذبہ، جوش اور ولولہ دیکھنے کے قابل تھا - ان کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ۳؍ دسمبر کو جب مغربی محاذ پہ جنگ کا بگل بجا تو سوار شہید نے موت کے اس چیلنج کو بڑی مسرت اور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا۔

وہ فوج میں ڈرائیور تھے اور ایک ڈرائیور کی ڈیوٹی عام سپاہیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے لیکن وہ کبھی چھپ کر خندق میں نہ بیٹھے۔ ہمیشہ بڑی جرأت سے سینہ تان کر اپنی رجمنٹ کے جوانوں کے ساتھ ساتھ رہے۔

۳ر دسمبر کی رات کو جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دشمن کی توپوں کی گھن گرج گولہ باری سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دشمن کی توپیں اور ٹینک مسلسل آگ اگل رہے تھے۔ موضع باہیر پر جہاں سوار شہید کی رجمنٹ تھی، دشمن زبردست گولہ باری کر رہا تھا۔ محمد حسین شہید کا جوش شہادت قابل دید تھا۔ اسے نہ توپوں کی پرواہ تھی اور نہ ٹینکوں کا خوف۔ وہ جان ہار ہتھیلی پر جان رکھ کر خوشی خوشی ایک خندق سے دوسری خندق میں گولہ بارود پہنچا رہا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، سوار شہید کا جوش اور ولولہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک دن ایک گشتی دستے کے ہمراہ موضع ہراز خورد میں گشت کر رہے تھے کہ موضع خیرا کے سامنے دشمن کو دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ، نعرہ حیدری بلند کیا اور اپنی رائفل سے دشمن پر پل پڑے اور ان کی آن کو ڈھیر کر دیا۔

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

میدان کارزار میں ان کی بہادری کے روح پرور قصے

اب ہر کسی کی زبان پر تھے۔ ۱۰ دسمبر کا سورج طلوع ہوا۔ یہ شہید کی زندگی کا آخری دن تھا۔ دشمن نہایت ہی اہم پوزیشن پر قبضہ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ انھیں پتہ چلا تو وہ دوڑتے ہوئے اپنی رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ کے پاس پہنچے اور اسے خطرے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دشمن موضع ہرار خورد میں اس جگہ پہنچ چکا ہے جہاں پاک فوج نے سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ اس روز ان کا شوق شہادت قابل دید تھا۔ صبح سے لے کر شام تک اپنے جوانوں کو دشمن کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں سے گزر کر ایک سے دوسری جگہ جاتے۔ ان کے دائیں بائیں اور اوپر سے گولے گزر رہے تھے۔ لیکن ایک مرد مومن تو

ع۔ او خود اندیش است و مرگ اندیش نیست

ان کی صحیح اور مفید اطلاعات سے پاک فوج کے جوان دشمن کے ٹینکوں اور فوجی ٹھکانوں پر صحیح نشانے لگاتے رہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے اور یہ سارا دن انھوں نے دشمن کی اندھا دھند

فائرنگ میں باہر ہی گزار دیا۔ یہ سوار شہید کی بے مثال جرأت اور دلیری کا نتیجہ تھا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے دشمن کے سولہ ٹینک تباہ ہو چکے تھے۔ ان سب ٹینکوں کی نشان دہی اور تباہی کی تصدیق بھی محمد حسین شہید نے خود ہی کی تھی۔

ادھر سے ذرا فراغت ملی تو گاجگل پُل کا رخ کیا، جو فوجی نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم تھا۔ وہاں سوار شہید نے جس ناقابل فراموش بہادری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خود انہی کی رجمنٹ (۲۰ لانسر) کے ایک افسر صوبیدار امیر عالم کا کہنا ہے کہ دشمن اس پُل پر قبضہ کرنے کے لئے اندھا دھند گولہ باری کر رہا تھا۔ سوار شہید کا ایمانی جذبہ آج قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلا رہا تھا۔ انہیں کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر وہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اطلاعات بہم پہنچا رہے تھے۔ ہر بار اپنی خندق سے باہر جا کر دشمن کی تباہ کن فائرنگ کرنے والی توپ کی صحیح پوزیشن کو جانچ کر وہاں گولہ پھینکنے کی تاکید کرتے۔ بالآخر ان

کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ایک ہی صحیح نشانے سے وہ کئی دہانوں والی توپ خاموش ہو گئی۔ سوار شہید نے جوش مسرت سے اپنی بیرٹ فضا میں اچھالی اور اپنے ساتھی مجاہدوں کو جوش دلانے کے لئے پورے زور سے نعرہ رسالت بلند کیا۔ صوبیدار نے رندھی ہوئی آوازمیں بتایا کہ ان کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ تھا۔ وہ سنسناتی ہوئی گولیوں میں بار بار خندق پر کھڑے ہو جاتے اور پورے جوش سے نعرۂ تکبیر اور نعرۂ رسالت بلند کرتے اور پھر خندق میں چلے جاتے۔

اب کے اچانک وہ سینہ تان کر خندق سے باہر کود آئے۔ دشمن کے ٹینک اور مشین گنیں اسی لمحے کے لیے بیتاب اور منتظر تھیں۔ انھوں نے فائر کھول دیا۔ سوار شہید کا سینہ چھلنی ہو گیا اور یوں ارض پاک کا وہ جانباز سپاہی ارض وطن پر نثار ہو گیا۔

سوار شہید کا آخری سفر

جنگ ختم ہوئی تو ۱۰ر جنوری ۱۹۷۲ر کو انھیں اپنے

آبائی گاؤں پہنچانے کی تیاریاں ہوئیں۔ دوپہر کا وقت تھا کہ منڈرہ چکوال روڈ پر کچھ فوجی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ ان میں ۲۰ لانسر کے فوجی جوان سوار تھے۔ سب کے چہروں پر افسردگی اور حسرت کے نشان تھے۔ آنکھیں نم آلود تھیں۔ ان سب نے محمدؐ حسین شہید کی جرأت ایمانی کو آنکھوں سے دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا۔ فوجی گاڑیاں موہڑہ حیات پہنچ کر رک گئیں۔ جوانوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پھولوں سے ڈھکا ہوا ایک تابوت اتارا تو موہڑہ حیات کی بستی کے بچے بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بستی کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ ماں نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ جواں سال بیوی نے چہرہ نوچ لیا۔ بہن سر پیٹ کر رہ گئی لیکن ایک بوڑھا آدمی نہایت متانت اور صبر سے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے مگر اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نعرہ تکبیر بلند کیا اور کہا "میرا بیٹا شہید ہے، وہ مرا نہیں، وہ زندہ ہے

شہید کو کیوں روتے ہو۔ خدا کے لیے یہ رونا دھونا بند کرو۔ بوڑھے باپ روز علی نے کلمہ شریف کا ورد کرتے ہوئے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تابوت کو کندھا دیا اور اپنے کچے اور مٹیالے گھر سے چند گز دور ٹنڈ منڈ درختوں کے ایک جھنڈ تلے اپنے اس اکلوتے نوجوان بیٹے کو لحد میں اتار دیا۔ یہ اس شہید وطن محمد حسین سوار نشان حیدر کا آخری سفر تھا ؎

میجر شبیر شریف شہید ستارہ جرأت

(نشان حیدر)

میجر شبیر شریف وہ فتح نصیب فوجی تھے جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چھمب جوڑیاں سیکٹر میں ستارۂ جرأت بن کر چکے۔ اس محاذ پر دشمن پہ کامل فتح پا کر غازی کے لقب سے ملقب ہوئے۔ حکومت پاکستان نے ان کی اس شاندار کارکردگی پر ستارہ جرات کے فوجی اعزاز سے نوازا۔

چند سال بعد ۱۹۷۱ء میں دشمن نے پھر ہمیں للکارا۔ میجر شبیر شریف شہید نے پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ میں بے مثال جرأت، دلیری اور بہترین تدبر اور فوجی حکمت عملی کی مثال قائم کر کے جام شہادت نوش کیا۔

اور پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشانِ حیدر" حاصل کیا۔ گویا آپ وہ خوش نصیب انسان ہیں جنھیں غازی اور شہید ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

آپ ۲۸ر اپریل ۱۹۴۳ء کو ضلع گجرات کے مشہور قصبہ کنجاہ کے ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ اپنی بہادری، دلیری اور شجاعت کے علاوہ اسلامی روایات اور فوجی خدمات کے لئے مشہور تھا۔ آپ کے والد بھی فوج میں میجر تھے۔ ۱۹۶۵ء کے معرکہ میں ان کے سگے بھائی کیپٹن ممتاز شریف نے شاندار خدمات انجام دیں، جن کے صلہ میں انھیں "ستارہ بسالت" عطا ہوا۔ تھوڑا سا آگے چل کر ان کی خاندانی کڑیاں میجر عزیز بھٹی شہید کے خاندان سے جا ملتی ہیں۔ آپ نے ایک خالص اسلامی ماحول میں آنکھ کھولی اور ایک دین دار متقی، پرہیز گار اور تہجد گزار ماں کی آغوش میں پرورش پائی۔ آپ کے آبا و اجداد کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے والہانہ عقیدت تھی۔ والد بزرگوار چونکہ ملازمت میں تھے، اس لیے ننھے شبیر نے ابتدائی تعلیم مختلف جگہوں اور مختلف

مدرسوں میں حاصل کی - پہلے پنڈی کے ایک سکول میں داخلہ لیا - جب والد صاحب مری تبدیل ہوئے تو وہاں جا داخل ہوئے - وہاں سے کوئٹہ جا پہنچے تو گرامر سکول کوئٹہ میں داخلہ لے لیا - ۱۹۵۹ء میں لاہور آئے تو سینٹ اینتھونی سکول میں داخلہ لیا -

ادھر سے فارغ التحصیل ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کا رخ کیا - کالج میں کھیلوں کے اندر خوب نام پیدا کیا - کالج میں پہلے سال کے اندر ہی وہ کیڈٹ کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گئے - اور یہی اس نوجوان کا نصب العین تھا - وہ بچپن ہی سے پاکستان کے دفاع کی خاطر فوج میں جانے کے خواہش مند تھے - اب ادھر پہنچ کر ان کی طبع رسا کے اصل جوہر کھلے - وہ ہر میدان میں اپنے ساتھیوں سے بہت آگے تھے - پاسنگ آؤٹ پریڈ میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اعزازی شمشیر بھی حاصل کی - وہ ایک راست گفتار ، راست کردار ، بیباک اور نڈر فوجی افسر تھے - آپ کا نقطۂ نظر ابتدا سے انتہا تک خالص اسلامی رہا - عمر بھر وہ اسی محور کے گرد گھومتے رہے - ان

کی دلی خواہش تھی کہ وہ اسلام اور ناموس اسلام کی خاطر جان کی بازی لگا دیں نماز ، روزہ کے سختی سے پابند تھے ۔ کٹھن سے کٹھن کام میں دوسروں کے کام آتے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے عمدہ اخلاق کی بنا پر وہ فوجی حلقوں میں بہت مقبول ہو گئے اور پھر ۱۹۶۵ء کے معرکہ میں ستارۂ جرأت بن کر چمکے ۔

پھر چند سال کا وقفہ بظاہر خاموشی کا تھا مگر عارضی ۔ دشمن کے ہاں اندر ہی اندر مواد پک رہا تھا عجیب و غریب سازشیں ہو رہی تھیں حتیٰ کہ وہ ساعت آن پہنچی جس کا انھیں اک مدت سے انتظار تھا۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف کھلم کھلا جارحیت شروع کر دی۔ مشرقی پاکستان کے بعد ادھر مغربی محاذ پر بھی جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے ۔ وطن عزیز کے تحفظ کے لیے اس مرد مجاہد کو سلیمانکی ، فاضلکا سیکٹر میں تعینات کیا گیا ۔ ۳؍ دسمبر ۱۹۷۱ء کو آپ اپنے کمانڈر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ دشمن نے تو ہر طرف محاذ کھول دیا ہے ۔ ہم کب تک دفاع کرتے رہیں گے ۔

میرے شوق شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ میں آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ خود اسی کے مورچوں میں کروں۔ لیکن کمانڈر نے بڑی شفقت اور محبت سے سمجھایا کہ دشمن کی عیاری، مکاری اور اس کی فوجی برتری کو فراموش نہ کرو۔ ارد گرد کا سب علاقہ بارودی سرنگوں سے اٹا پڑا ہے۔ سامنے والے مصنوعی بند کے پیچھے دشمن کے ٹینکوں کی آہنی دیوار ہے اور بند سے ذرا ادھر دشمن نے ہماری بی آر بی نہر کی طرح بہت چوڑی اور گہری نہر کھودی ہوئی ہے اور اس کی بھاری اور ہلکی ہر قسم کی توپیں گولہ باری کے لیے تیار ہیں۔ ذرا احتیاط سے کام لو۔ شبیر شریف نے سر جھکا کر بڑے ادب اور اطمینان سے جواب دیا کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر میں تو اللہ کا سپاہی ہوں اور میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ پامردیٔ مومن کو دیکھ کر کمانڈر نے پیش قدمی کی اجازت دے دی۔

ذرا سی پیش قدمی پہ اب سامنے دشمن کی دفاعی نہر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑا بلند اور مضبوط بند تھا

اور ساتھ ہی لوہے اور کنکریٹ کے پکے مورچے تھے۔ یہ بند دو بستیوں سے ملا ہوا تھا۔ ایک بستی کا نام گورکھیٹرہ اور دوسری کا نام بیری والا تھا۔ چونکہ فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت اہم جگہ تھی۔ اس لئے یہاں بھارت نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ مرد مومن نے خدا کا نام کا سہارا لیا اور دشمن پر بجلی کی طرح گرے۔ حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ دشمن بوکھلا اٹھا۔ میجر شبیر کی سرکردگی میں پاک فوج نے وہ پکے اور مضبوط مورچے چند منٹوں کے اندر روند ڈالے۔ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ پسپا ہوا تو شہید نے دباؤ اتنا زیادہ کر دیا کہ کہیں اس کے پاؤں جم ہی نہ سکتے۔ چھانگہ کی اہم چوکی پر پاک فوج کا جھنڈا لہرا دیا۔ آگے بارودی سرنگیں اور پھر دفاعی نہر تھی، ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنا آسان کام نہ تھا۔ ادھر دشمن کو اپنی دفاعی تیاریوں پر ناز تھا۔ مگر اللہ کے یہ مجاہد گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتے ہی چلے گئے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے گولے ہی گولے پھٹ رہے

تھے۔ خود کار ہتھیار آگ اگل رہے تھے مگر آدھ گھنٹہ
نہ گزرا تھا کہ میجر شبیر اور ان کے ساتھی مجاہد بھارت
کے اندر دو میل تک گھس چکے تھے۔ بیری والا اب
ان کے قبضہ میں تھا۔ دشمن نے گورکھیڑہ کا رخ کیا۔
یہ ان کا زبردست دفاعی مورچہ تھا۔

میجر شہید نے دم بھر ستانے کے بعد وائرلیس پر
اپنے کمانڈر سے رابطہ قائم کیا تو اس نے پھر سخت احتیاط
برتنے کی تاکید کی مگر شوق شہادت تو ایسی احتیاطوں
سے بے نیاز ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب
کر کے ایک ولولہ انگیز تقریر کی، جس نے ان کے دلوں
میں دلیری و شجاعت کی اک نئی چنگاری سلگا دی۔ سب
ایک ہی عزم اور ایک ہی ولولے سے آگے بڑھے
اور نہر تک جا پہنچے۔ رات بھیگ چکی تھی۔ بارودی
دھوئیں نے فضا میں اک کہرا بچھا رکھا تھا۔ دسمبر کا مہینہ
رات کا وقت، کڑاکے کی سردی، نہر کا ٹھنڈا یخ
پانی مگر میجر شبیر اور ان کے ساتھی اللہ کا نام لے کر
آگے بڑھتے ہی گئے۔ دشمن کی کوئی رکاوٹ ان کے

عزم اور پاؤں کو لڑکھڑا نہ سکی اور وہ نہر پار کر گئے
دشمن بوکھلا اٹھا۔ اب اللہ کے یہ شیر دشمن کے پیچھے
موریچوں پہ تھے۔ دست بدست لڑائی ہوئی۔ پاک مجاہدوں
کے حملۂ ترکانہ کی تاب نہ لا کر بھارتی بزدل پھر سر پر
پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میجر شہید نے بہتوں کو موت کے
گھاٹ اتارا اور بہتوں کو جنگی قیدی بنا کر مورچوں پر
قبضہ جما لیا۔ فضا نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی۔ یہ
میجر شبیر شہید کی قیادت، دلیری اور ایمانی جرأت تھی جس
کے سامنے دشمن کا سب سازو سامان دھرا رہ گیا۔ بند
کا اہم حصّہ اور نہر کا اہم پُل اب پاک فوج کے
قبضے میں تھا۔ گورمکھیڑہ باقی علاقے سے کٹ چکا تھا۔
اتنی بڑی کامیابی محض ایک گھنٹے کے اندر حاصل ہوگئی
اسے پاک فوج کا معجزہ سمجھیے یا تائید آسمانی کہیے کہ
اب پاک فوج کے سامنے میلوں تک میدان صاف تھا۔
دشمن نے بدلہ لینے کے لیے کاروائی کی مگر منہ
کی کھائی۔ وہ تازہ کمک لے کر پھر حملہ آور ہوا اور
بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ جہاں ٹینکوں سے انسان ٹکرا

لے رہے تھے ۔ اُدھر ٹینکوں کی مدد کے لیے بھارتی فضائیہ اور اِدھر تھکے ماندے گشتی دستے کے چند مجاہد تھے لیکن ان کے قدم کسی صورت میں نہ ڈگمگائے ۔

اگلی رات انتہائی جرات سے کام لیتے ہوئے میجر شبیر مورچے سے باہر کود پڑے اور بھارتی فوج کے کمانڈر کو جا دبوچا ۔ اسی کی سٹین گن سے اس کا کام تمام کیا اور اہم فوجی دستاویزات پر قبضہ کر لیا ۔

۱۰ دسمبر کی رات کو دشمن نے پے در پے کئی حملے کئے مگر ہر بار منہ کی کھائی اور مجبوراً پھر پسپا ہوا ۔ فضائیہ کی چھاؤں میں دشمن پھر آگے بڑھا اور پوری فوجی قوت میدان میں جھونک دی ۔ پاک فوج نے اپنے صحیح نشانوں سے ان کے کئی ٹینک تباہ کیے ۔ اچانک ایک گولہ آیا اور میجر شبیر کے سینہ میں دائیں جانب پیوست ہو گیا ۔ اس وقت جب کہ موت ان کے درِ دل پہ دستک دے رہی تھی وہ اپنے ساتھیوں کو للکار کر کہہ رہے تھے ۔ دیکھنا ساتھیو! اس فوجی اہمیت کے پل کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا

یا میرے نقش قدم پر چل کر میرے پاس چلے آنا اور یا دشمن کا نقش پا ادھر سے مٹا دینا۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ان کی زبان پر کلمہ شہادت کا ورد تھا اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ اپنا مشن پورا کر چکے تھے۔ ہائے کیا زندگی تھی اور کتنی شاندار موت!

؎ گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضٰے چیزی دگر

لانس نائک محمد محفوظ شہید
(نشانِ حیدر)

لانس نائک محمد محفوظ وہ خوش نصیب سپاہی جس نے ملک و ملّت کی سالمیت اور پاکستان کی سر بلندی کے لیے مردانہ وار جان دے کر نہ صرف نشانِ حیدر حاصل کیا بلکہ زندگئ جاوید حاصل کر لی۔ محفوظ شہید کا یہ بے مثال کارنامہ اور یہ عظیم قربانی تاریخ پاکستان میں سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔

محمد محفوظ شہید نے پنڈ ملکان میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ایک فوجی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ پنڈ ملکان تحصیل راولپنڈی میں ایک دور افتادہ گاؤں ہے جو کہوٹہ سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ والد کا نام مہربان خان اور ماں کا نام سرور جان تھا۔ شہید کے باپ اور دادا دونوں فوجی تھے اور اعلیٰ فوجی خدمات کے صلے میں تمغہ یافتہ تھے۔ ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی اکثر و بیشتر فوجی ملازم تھے۔

ابتدائی تعلیم بھمبر ترار میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے طبیعت کھیلوں کی طرف بہت مائل تھی۔ طالب علمی کے دنوں میں والی بال اور کبڈی سے گہری دلچسپی تھی۔ جب تک زندہ رہے کھیلوں میں ہمیشہ بھرپور حصہ لیا مگر یہ دونوں کھیل ان کا محبوب ترین مشغلہ تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے گھر کی فضا فوجی تھی ویسے بھی دور افتادہ گاؤں کا یہ دیہاتی ماحول اعلیٰ تعلیم کا ماحول نہ تھا۔ وہ بھی اپنے باپ دادا اور دیگر عزیزوں کے نقش قدم پر چل کر ملک و ملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ بچپن ہی سے فوجی ملازمت ان کا نصب العین تھا۔ پڑھائی سے فارغ ہوئے تو کم سنی کے باعث فوج میں جا نہ سکتے تھے لہذا وہیں اپنے گاؤں میں کھیتی باڑی کے سلسلے میں اپنے بوڑھے دادا کا ہاتھ بٹانے لگے۔

۱۹۶۲ء میں جونہی عمر کے اٹھارہ سال ہوئے فوراً اپنے آپ کو فوجی بھرتی کے لیے پیش کر دیا۔ محفوظ شہید کی اٹھتی جوانی تھی۔ گٹھا ہوا سڈول جسم، متناسب اعضا، رنگ سفید اور چہرہ باوقار تھا۔ پیشانی پر شہادت اور

نشانِ حیدر کی سنہری اور روپہلی جھلک تھی - ریکروٹنگ افسر کی نگاہِ انتخاب سب سے پہلے اسی جوہرِ قابل پہ پڑی۔ شہید کی دلی مراد بر آئی - کچھ دیر مردان میں فوجی ٹریننگ لی اور پھر مزید فوجی تربیت کے لیے کوئٹہ چلے گئے اور بالآخر ۱۵ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ ہو گئے۔ مختصر سی نو سالہ فوجی ملازمت میں شہید نے دو جنگیں لڑیں - دونوں میں بھر پور حصہ لیا - پہلی جنگ میں بھی خوب دادِ شجاعت دی - مگر دوسری جنگ میں تو اس بہادر نوجوان نے اس خوشی، بہادری اور شجاعت سے جان کا نذرانہ پیش کیا کہ پاکستان کے سب سے بڑے فوجی اعزاز کے حقدار ٹھہرے -

بھارت نے مشرقی پاکستان پہ حملہ کر دیا ہوا تھا۔ دسمبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا- ابھی مغربی سرحدوں پہ اس نے حملہ نہیں کیا تھا - نومبر کے آخری دنوں میں اپنی دادی کے انتقال پہ وہ پانچ دن کی چھٹی لے کر گھر آئے - ٹرانسسٹر ریڈیو ساتھ لائے - ہر وقت اسے کان سے لگائے رکھتے - مشرقی پاکستان میں کئی سال تک

فوجی خدمات سر انجام دی تھیں۔ وہاں کے چپے چپے سے
واقف تھے۔ فوجی اہمیت کے مقامات سے پوری طرح شناسا
تھے۔ سارا دن بس جنگی تجربوں ہی سے سروکار تھا۔ چھٹی
کے ابھی دو دن ہی گزرنے پائے تھے کہ دشمن نے
مغربی سرحدوں پہ حملہ کر دیا۔ جس مجاہد کے نصیب میں
یہ سعادت اور یہ اعزاز لکھا تھا، اشتیاقِ جنگ میں اُن
کے ولولوں کا کیا کہنا! حملے کی خبر سنتے ہی ان کا
خون کھول اُٹھا۔ کہنے لگے ہم بیابان میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
باقی ماندہ چھٹی کا کسے خیال؟ گھر والوں کو خداحافظ
کہا اور سفر شہادت پہ روانہ ہوئے۔ چلتے وقت باپ
نے کہا: ”محفوظ بیٹا جان بچانا عین فرض ہے لیکن بزدلی
کبھی نہ دکھانا اور ہتھیار نہ ڈالنا۔“ شہید کے چہرے پہ
ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور مجاہدانہ انداز میں باپ سے
کہا: ”آپ مطمئن رہیں“ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن
جو گولی محفوظ کے سینے بنی ہے اس سے کیسے بچ
سکوں گا۔ میری مجاہدانہ سرگرمیوں کو آپ دیکھ تو نہیں سکیں گے مگر خدا نے
چاہا تو میری یا پھر کسی کی زبانی سن تو ضرور لیں گے۔

محفوظ شعلے کی طرح لپکے اور آ کر اپنی کمپنی میں حاضر ہو گئے ۔روانگی کے وقت پنجاب ٹپالین کی اس کمپنی کو یہ حکم ملا کہ وہ سرحدی چوکی " پل کنجری" پر دشمن کو کسی صورت میں دوبارہ قبضہ نہ کرنے دے ۔واہگہ اٹاری سیکٹر میں اس بھارتی چوکی پر پاک فوج کا قبضہ تھا ہمارے جیالے آگے بڑھے۔ دشمن سے مڈ بھیڑ ہوئی جس کی نفری دو رجمنٹ سے کم نہ تھی اور ادھر مٹھی بھر جواں سال مجاہد ۔ دشمن نے توپخانے کا فائر کھول کر خود کار ہتھیاروں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہر طرف شعلے بھڑک رہے تھے ۔ آگ کا اک سمندر تھا ۔ فضا غبار اور دھوئیں سے اٹی پڑی تھی مگر محفوظ میاں کا شوق شہادت ان سب خطرات سے بالکل بے نیاز تھا۔ عزم و شجاعت کے اس پیکر کی مثال کو دیکھ کر اس کے ساتھی بھی انتہائی نا مساعد حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے چٹان کی طرح ڈٹ گئے۔ دشمن کو عددی برتری حاصل تھی ۔ وہ انھیں گھیرے میں لے کر بے بس کرنا چاہتا تھا مگر خدا اور رسولؐ کے ان سپاہیوں بلکہ

شیدائیوں نے ہر مرتبہ اسے ناکام کر دیا۔ دشمن کو ہر مرتبہ زک اٹھا کر ناکام لوٹنا پڑا۔ وہ ہر مرتبہ نئی کمک لے کر بپھرا ہوا آتا۔ اس نازک صورت حال میں لانس نائک محمد محفوظ نے اپنی ہلکی مشین گن سے دشمن کی پوزیشنوں کو الجھایا ہوا تھا۔ اچانک دشمن کا ایک گولہ آ کر اس کی گن پر لگا اور وہ بیکار ہو گئی۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے عجیب کش مکش تھی۔ مگر شہید کو یاد تھا کہ ع مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

ادھر ادھر دیکھا تو اپنے ایک ساتھی کو زخمی کو شہید پایا۔ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سے بےخبر بے نیاز جذبہ شہادت سے سرشار وہ آگے بڑھے اور لپک کر وہ ہلکی مشین گن سنبھال لی اور پھر ٹھیک نشانے لگا کر دشمن کے مورچوں میں تہلکہ مچا دیا۔ شہید نے بھانپ لیا تھا کہ دشمن کی سامنے والی توپ نے اس کی کمپنی کی پیش قدمی کو روک رکھا ہے، جب تک اسے خاموش کیا جائے آگے بڑھنا محال ہے۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھے کہ آخر وہ گولہ آن پہنچا جو محفوظ کے لیے

بنا تھا۔ گولہ لگنے سے ان کی دونوں ٹانگیں بری طرح چھلنی ہو گئیں۔ خون کے دھارے بہہ رہے تھے۔ مگر عزم و استقلال کے اس پیکر نے تو اپنے جی میں کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ رینگ کر دشمن کے مورچوں کی طرف بڑھے، جونہی دشمن کے قریب پہنچے تو مرد مومن کے جذبۂ شہادت نے جوش مارا۔ غیر معمولی ہمت سے کام لے کر اٹھے اور دشمن کے مورچے میں گھس گئے۔ مگر داخل ہوتے ہی اس بہادر نوجوان نے سینے میں گولی کھائی لیکن آہنی عزم میں فرق نہ آیا اور آخری جست لگا کر دشمن کے توپچیوں میں سے ایک کا گلا دبوچ لیا۔ بھارتی بنکر میں موجود دوسرے فوجی نے گھائل محفوظ پر حملہ کر دیا۔ دشمن نے قیدی بنانے کی پیش کش کی۔ اسے حقارت سے ٹھکرا دیا کہ مرد مومن کے یہ شایان شان نہیں۔ بھارتیوں نے مرد مجاہد کے بدن میں سنگینیں گھونپ دیں مگر آپ نے جس دشمن کو پکڑ رکھا تھا اسے نہ چھوڑا۔ وہ اپنا کام تمام کر چکے تھے۔ دسمبر کی ۱۸ تاریخ کو ان کی شہادت کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔

ادھر وہ توپ خموش ہو گئی - ان کی غیر معمولی جرأت اور بہادری کمپنی کے باقی جوانوں کے لیے انتہائی ولولہ انگیز تھی وہ چٹانوں سے پہاڑ بن گئے محفوظ کی روح فردوس بریں میں شہدائے اسلام سے جا ملی تھی مگر اس بھارتی چوکی پر پاکستانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔

جنگ بندی کے بعد جب طرفین کے کمانڈروں میں ملاقات ہوئی تو بھارتی کمانڈر نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ ہم نے لانس نائک محفوظ کے انفرادی کارنامے سے بڑھ کر اس معرکہ میں کوئی کارنامہ نہیں دیکھا

۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ کو شہید کی لاش کو ان کے آبائی گاؤں پنڈ ملکاں لے جایا گیا اور ۲۰ تاریخ کو پورے فوجی اعزازات کے ساتھ نشانِ حیدر کے اس وارث کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

خاک کا یہ ڈھیر پاک مجاہدوں کے دل ہمیشہ گرماتا رہے گا اور وہ مشکل سے مشکل حالات میں ان کے لیئے نشان راہ بن کر چمکتا رہے گا -

ع صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

میجر طفیل محمدؐ شہید

(فاتح لکشمی پور)

یہ داستان ہے دوسرے نشان حیدر کی ۔ یہ داستان ہے ایسٹ پاکستان رائفلز کے بہادر سپاہی کی اور یہ داستان ہے میجر طفیل محمد شہید کی ، جس کی شخصیت میں حب الوطنی ، ایثار اور قربانی سمٹ کر رہ گئی تھی ۔

مشرقی پاکستان میں برہمن باڑیہ کی تحصیل میں لکشمی پور ایک چھوٹا سا سرحدی گاؤں ہے جس کی آبادی لے دے کے کوئی ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی ۔ ہندو مسلمان ملے جلے تھے ۔ ۱۹۵۷ء میں جب پاک بھارت باؤنڈری کی نشان دہی کی گئی تو ضلع پترا پر پاکستان

کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور یوں لکشمی پور، پاکستان کو مل گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں کے کرتا دھرتا ہندوؤں نے بھارتی حکمرانوں کو مشتعل کر کے لکشمی پور پر قبضہ کے لیے اکسایا اور ۱۹۵۸ء میں جولائی کی آخری تاریخوں میں تری پورہ سے ایک سو افراد پر مشتمل بھارتی فورس لکشمی پور میں گھس آئی اور آبادی میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ اب یہ علاقہ بھارتی سرکار کا ہے۔ مسلمانوں کو خوب ہراساں کیا۔ دھاندلی اور دھونس کی یہ ایک سخت شرمناک واردات تھی جو پاکستان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ لکشمی پور کے مسلمان جمع ہو کر بھارتی فوجی افسروں کے پاس گئے۔ اور کہا کہ یہاں تو پاک حد بندی کے نشانات بھی موجود ہیں۔ اس نے سختی سے ڈانٹ کر کہا: بھاگ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ لکشمی پور بھارت کا ہے اور بھارت ہی کا رہے گا۔ بلا لاؤ اپنی فوج اس سے بھی نپٹ لیں گے۔"

بات چل نکلی۔ کرنل سے بریگیڈیر اور بالآخر میجر امراؤ خاں تک پہنچی۔ ان کے لیئے یہ اک رستا ہوا ناسور

تھا اور بالآخر فوجی اقدام کے لیے قرعہ بنام میجر طفیل نکلا۔ میجر صاحب سے افسران بالا کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ منصوبے پر بحث و تمحیص کے بعد کمانڈر نے میجر طفیل سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری پہچانتے ہیں۔ میجر طفیل نے خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب آگے بڑھا دی۔ کتاب کا عنوان تھا "ہم جب مرتے ہیں تو اکیلے مرتے ہیں۔"

میجر شہید نے اپنی کمپنی کے جوانوں کو اکٹھا کیا اور نہایت ٹھہرے ہوئے جوشیلے انداز میں کہا "تفصیلات تم نے سن لیں۔ اللہ کے سپاہیو! اس معرکہ پر پاکستان کے وقار کا انحصار ہے۔ آپ کو اجازت ہے صرف وہی آگے آئیں جو جذبۂ جہاد اور ایمان کی روشنی سے سرشار ہیں۔ جو نہ جانا چاہے، بڑی خوشی سے لوٹ جائے۔ ساری کمپنی میں مشرقی پاکستان کے من چلے جوان تھے۔ سب کے چہرے اندرونی حرارت سے تمتما اٹھے۔ ہر کسی نے پاکستان کی حرمت پر کٹ مرنے کا عہد کیا۔

ادھر لکشمی پور پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے بھارتی

فوج نے ایک اہم ٹیکری پہ اپنا مورچہ بنا رکھا تھا لکشمی پور کے اس ٹیلے کے ارد گرد چاروں طرف پانی تھا۔ صرف ٹیلے تک ایک ہی راستہ جاتا تھا۔ اس پہ دشمن نے مشین گن نصب کر کے ارد گرد خار دار تاروں سے جال بُن رکھا تھا۔ میجر شہید نے اپنے جوانوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے فیصلہ کیا کہ دو مختلف مقاموں پہ ایک پلاٹون حملہ کرے اور تیسری پلاٹون ایک لمبا چکر کاٹ کر بھارتی علاقے میں گھس کر وہاں سے حملہ کرے اور یہی خطرناک راہ تھی۔ ساتھیوں نے جرأت کر کے کہا بھی کہ آپ اس پلاٹون میں شامل نہ ہوں، ہم حاضر ہیں۔ آپ نے مسکرا کر کہا: "میں جانتا ہوں۔ اس راہ کی مشکلات کو بھی، اور آپ لوگوں کے جذبات کو بھی لیکن میرا اسی پلاٹون میں رہنا مناسب ہو گا۔ کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ میں اس معرکے میں کام آ جاؤں۔ اللہ کے سپاہی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سی با عزت موت ہو سکتی ہے۔"

ع شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

۱۶ اور ۱۷ اگست کی درمیانی رات کو میجر شہید اپنے جوانوں سمیت چٹاگانگ سے سلہٹ جانے والی گاڑی پہ سوار ہوئے۔ اندھیری رات میں گاڑی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی اور میجر شہید ڈرائیور کے ساتھ خاموشی سے بیٹھے اپنے خیالات میں گم سم تھے۔ ڈرائیور اپنے خیالات میں مست اور گاڑی انتہائی تیزی سے اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ لکشمی پور سے چند میل ادھر ہی میجر شہید نے ڈرائیور سے کہا کہ انجن کی بتیاں گل کر دو۔ رات ڈھل چلی تھی ایک بجے کا وقت ہو گا۔ میجر صاحب نے گاڑی جنگل میں کھڑی کرا دی اور جوانوں کو اللہ کا نام لے کر ان کے راستوں پہ ڈال دیا۔

لکشمی پور میں ہو کا عالم تھا جب پہلی دونوں پلٹنیں اپنی منزل پر پہنچا دیں تو اب میجر شہید خود تیسری کو لے کر چکر کاٹتے ہوئے بھارتی علاقے میں داخل ہوئے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ ہوا بھی تیز ہو گئی اسے تائید غیبی سمجھا۔ اب وہ

بھارتی سنتریوں کے بالکل قریب جا پہنچے ۔ دشمن کے سپاہی خراٹے لے رہے ہیں ۔ یکایک پہرے دار سپاہی کو کچھ کھسر پھسر کا شک ہوتا ہے ۔ دوسرے پہرے دار بھی چوکنے ہو جاتے ہیں ۔ ادھر میجر طفیل شہید اور ان کے ساتھی لے دے کے تیس فٹ کے فاصلے پر تھے ۔ دشمن نے فائر کھول دیا ۔ رات کی اس پُر اسرار خاموشی میں فائر کی آواز سے سارا علاقہ گونج اٹھا ۔ ادھر سے نعرۂ حیدری کی صدا سے فضا گونج اٹھتی ہے ۔ ارد گرد کے پہاڑی ٹیلے تھرا اٹھتے ہیں ۔ اور "یا علی" کے الفاظ ، دشمن کی مشین گن سے نکلنے والا پہلا برسٹ میجر شہید نے اپنے سینے پر روکا ۔ وہ گھائل ہو کر گر گئے ۔ ساتھی شوق شہادت میں مست کچھ نہیں جانتے کہ ان کے امیر پر کیا بیت رہی ہے ۔ وہ بھی گولیاں برسا رہے ہیں اور میجر طفیل بھی ایک ہاتھ سے پیٹ کو سنبھال کر برابر آگے بڑھ رہے ہیں ۔ جوانوں کو للکار کر ان کے دلوں کو گرما رہے ہیں ۔ ان کے حوصلے بڑھا رہے ہیں ۔ ان کے ہاتھ میں دو دستی بم تھے ۔ میجر

شہید نے احتیاط سے نشانہ باندھ کر ایک بم پھینکا اور دشمن کا مورچہ تباہ ہو گیا۔ اس کی مشین گنیں بھک سے اڑ گئیں۔ ان کے کئی سپاہی ہلاک ہو گئے، کئی زخمی ہوئے اور کچھ اس اندھیرے میں بھاگ نکلے۔

دشمن کی دوسری پوسٹ ہنوز باقی تھی۔ ادھر سے فائر کھل جاتا ہے جسے میجر شہید کا شیر دل ساتھی جمعدار محمد اعظم اپنے کشادہ سینے پہ لیتا ہے اور شہادت کا جام نوش کرتا ہے۔ ادھر میجر صاحب کے زخموں سے خون کثرت سے بہہ چکا ہے۔ ان پر نزع کا سا عالم طاری ہے مگر عزم اور استقلال میں فرق نہیں آیا۔ جوانوں کو للکارتے ہیں "اللہ کے شیرو! تم نے میدان مار لیا اب فتح اور تم میں کوئی لمحوں کا فرق ہے۔ آگے بڑھو" اور خود وہ مرد مومن اسی احتیاط اور عزم سے دوسرا دستی بم پھینکتا ہے وہ بھی عین نشانے پہ بیٹھا اور بھارتی توپ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ کتنے سپاہی جہنم واصل ہوئے۔ باقی بھاگ نکلے۔ اب پاکستان کی باقی پلاٹون بھی آگ برسا رہی تھی۔ گھمسان کا

رن پڑا۔ جے ہند اور اللہ اکبر کے نعروں میں اب بھی میجر شہید کی آواز نمایاں طور پر گرجدار تھی۔

اتنے میں مشرقی افق پہ اجالا بھی ابھر آیا۔ ایک بھاری بھرکم جسم کا ہندوستانی افسر تیزی سے آگے بڑھ کر ایک پاکستانی جوان پر فائر کرنا چاہتا تھا کہ میجر شہید نے زمین پر لیٹے ہوئے اسی حالت میں اس کے پیٹ پر ایک لات جمائی۔ وہ آدمی منہ کے بل گرا۔ میجر شہید اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کو پہچان لیا کہ یہی بھارتی سپاہیوں کا سالار ہے۔ وہ اسے جانتے تھے کہ اس کا نام برمن ہے۔ میجر صاحب نے للکارا۔ "برمن تم اب میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتے"۔ کمزوری سے نڈھال تھے مگر اپنے سر سے آہنی ٹوپی اتاری اور برمن کی کھوپڑی پر پے در پے کئی ضربیں لگائیں اور اسے لہولہان کر کے رکھ دیا۔ اسی گیرودار میں وہ آہنی ٹوپی برمن کے ہاتھ لگی۔ اس نے میجر شہید کی پیشانی پر دے ماری۔ میجر کی پیشانی سے خون کے فوارے پھوٹ نکلے۔ آپ نے اپنے

ساتھیوں کو للکارا۔ یہ بزدل بھاگنے نہ پائے۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے گرد پاک مجاہدوں کا گھیرا تھا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا۔ میجر صاحب نے کہا "اسے مارنا نہیں پیچھے لے جاؤ۔"

اپنے کمانڈر کو پاکستانی فوجوں کا قیدی دیکھ کر بھارتی سپاہیوں کے رہے سہے پران بھی نکل گئے۔ ان کے قدم پہلے ہی اکھڑ چکے تھے۔ اب جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔ یہ سب ہو لیا۔ مگر ابھی تک کسی پاکستانی جوان کو علم تک نہیں کہ میجر صاحب کی اپنی کیفیت کیا ہے۔ ان کے سینے اور پیٹ میں کتنی ہی گولیاں پیوست تھیں۔ دن چڑھا، میجر شہید اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں اور لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ جوانوں نے دیکھا کہ وہ تو خون میں نہائے ہوئے ہیں۔ ان کے کلیجے منہ کو آ گئے۔ میجر صاحب نے کہا۔ "اپنے اپنے مورچے سنبھالو۔ میں ابھی معائنے کے لئے آیا ہوں۔"

ایک جوان اپنے سالار کو خون میں لت پت دیکھ کر رو پڑتا ہے۔ میجر صاحب کی اپنی آنکھیں بھی نم آلود

ہیں مگر اسے بڑی شفقت اور پیار سے تسلی دیتے ہیں کہ قوموں کی کھیتی کو خون ہی سے سینچا جاتا ہے۔ اب وہ بہت کمزور اور نڈھال ہو رہے ہیں۔ تیورا اور لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ انھیں اٹھا کر پیچھے لے آتے ہیں۔ بھارتی چوکیوں پر پاکستانی پرچم کو سیلوٹ کرتے ہیں۔ جوان یہ منظر دیکھ کر رو پڑتے ہیں۔ میجر طفیل کے زخمی ہونے کی خبر فوج کے اعلیٰ حکام کو پریشان کر دیتی ہے۔ ساتھ ہی میجر شہید کا پیغام ملتا ہے کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور لکشمی پور پر پاکستانی جھنڈا خدا کے فضل سے لہرا رہا ہے۔

انھیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ خون کافی بہہ چکا تھا انتڑیوں کو گولیوں نے چھلنی کر رکھا تھا۔ ڈاکٹروں سے جو کچھ بن پڑا انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بظاہر ان کی حالت خطرناک نہ تھی۔ وہ بڑے خوش و خرم نظر آتے تھے۔ مگر دشمن کی گولیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ اپریشن کے دوران ہی ان کی روح قفس عنصری

سے پرواز کر گئی۔ ان کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بڑے سکون سے گہری نیند سو رہے ہوں۔
شہادت کے بعد ان کی نعش کو پورے احترام کے ساتھ پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر ایک خوبصورت خوشبودار تابوت میں بند کر کے ان کے آبائی وطن بھیج دیا گیا۔
آج بھی ساہیوال کے ضلع میں اس شہیدِ وطن کی فاتحہ خوانی کے لیے ارد گرد سے لوگ آتے رہتے ہیں۔

؎ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

میجر عزیز بھٹی شہید

گجرات کو بھمبر سے ملانے والی سڑک کے پندرھویں میل کے نزدیک ایک چھوٹی سی خوبصورت بستی ہے جسے لادیاں کہتے ہیں ۔ اس بستی کے جنوب مشرقی کونے پر ایک خوب صورت سا باغیچہ ہے۔ اس باغیچے میں میجر عزیز بھٹی شہید، نشان حیدر کی آخری آرام گاہ ہے، جو ستمبر ۱۹۶۵ کی دفاعی جنگ کا ایک نہایت اہم اور قابل فخر کردار ہے۔

۶ ستمبر کو رات کی تاریکی میں بغیر کسی اعلان کے بھارت نے بزدلوں کی طرح لاہور پر تین طرف سے حملہ کر دیا ۔ پاک افواج دفاعی جنگ کے لیئے اپنے محاذ پہ پہنچ رہی ہیں ۔ صبح کے ساڑھے سات بجے کے قریب ایک تیز رفتار جیپ بی ۔ آر ۔ بی ۔ نہر کے پل کو پار کر کے رُکی ۔ اس سے ایک ممتاز چاق و

چوبند فوجی افسر نہایت تیزی اور مستعدی سے باہر نکلا۔
اس کی مخمور آنکھوں میں ایک کشش اور بھرپور شخصیت
میں عجیب جاذبیت تھی ۔ یہ میجر راجہ عزیز بھٹی تھے
جنھوں نے "تاریخ پاکستان کے ایک نئے باب کا عنوان
اپنے خون سے لکھا ۔ تیزی سے اپنی پلٹن کے جوانوں
کا جائزہ لیا اور ان کے جذبہ ایمان کو گرمانے کے لیے
کہا ۔"بہادرو ! سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جاؤ
کفر نے ایک بار پھر اسلام کو للکارا ہے ۔ ہم تم
بہت خوش نصیب ہیں کہ ملک و ملت کی حفاظت کا
مقدس فریضہ ہمیں سونپا گیا ہے ۔ اے اسلام کے شیرو!
اپنے جوش کردار کا ایسا مظاہرہ کرو کہ صلاح الدین ایوبی
اور سلطان ٹیپو شہید کی روحیں وجد میں آ جائیں ۔"پھر
آگے بڑھ کر برکی کے نوجوانوں کو مصروف کار دیکھ
کر ان کے دلوں کو گرمایا "تم شیر جوان ہو ۔ ہندوستانی
گیدڑ تمھارے سامنے کیسے آ سکیں گے ۔ اور پھر ۸½
بجے وہ برکی کے ایک چوبارے پر جہاں او۔پی
کی پوسٹ تھی ، پہنچ کر دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ

لینے میں مصروف ہو گئے ۔ انھیں کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے بی ۔ آر ۔ بی نہر کے دائیں کنارے رہنا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے پیچھے رہنے کی بجائے آگے او پی پوسٹ پر رہنا پسند کیا جو اس مرد مومن کی بے مثال شجاعت اور بے نظیر حب الوطنی کی ایک کھلی دلیل تھی۔ دوسرے لمحے میں فائر کا حکم جو دیا تو دشمن کی پوری کمپنی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ۔ دشمن نے اس چوبارہ پر ہوائی حملے سے بم پھینکنے کی بارہا کوشش کی ۔ آخر ایک مرتبہ بالائی حصے پر گولا لگا اور دوسری منزل کا ایک حصہ گر گیا ۔ مگر میجر عزیز اور ان کے ساتھی معجزانہ طور پر بچ گئے ۔ انھیں معلوم تھا کہ چوبارے والی اس پوسٹ کا اب دشمن کو علم ہے لیکن وہ پھر بھی وہیں ڈٹے رہے ۔ وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے مگر اس بلند مقام کو چھوڑنا جوانمردی کے خلاف سمجھا۔ دشمن کا دباؤ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا ۔ بڑا ہی نازک مرحلہ تھا مگر آپ ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لے کر عین صحیح نشانے پر فائرنگ کرواتے رہے جس سے دشمن کا جانی اور مالی نقصان ہوتا رہا اور اس

کی پیش قدمی رُکی رہی ۔ کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک دشمن ایک اِنچ بھی آگے نہ بڑھ سکا ۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹی حتیٰ کہ سات ستمبر کا سورج نمودار ہُوا ۔ صبحدم جو جائزہ لیا تو عین اس مقام پر گولہ باری کروائی جہاں دشمن رات بھر بارود اور اسلحہ کا ذخیرہ کرتا رہا تھا ۔ وہ بارود بھک سے اڑا اور ساتھ ہی ٹینک بھی ۔ دشمن بوکھلا اٹھا اور واپس بھاگا ۔ صبح سے دوپہر تک کھانے کا پھر کوئی ہوش نہیں ۔ دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتے پھر بھاگ کر تیزی سے اپنے مورچوں پر جاتے ۔ جوانوں کے دل گرماتے ۔ حوصلہ بڑھاتے ۔ اور کہتے کہ خدا کے شیرو ! ڈٹے رہو ۔ سارا دن اسی بھاگ دوڑ اور جنگ و جدال میں گزرا ۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی ۔ ہر طرف موت ہی موت تھی ۔ دوسری رات بھی چائے پی پی کر جاگتے ہی گزاری ۔ اگلے روز دشمن نے بھرپور حملہ کیا ۔ اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آپ نے جس ہمت ، عزم اور استقلال کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی ۔

کمانڈنگ آفیسر وائرلیس پہ کہتا ہے کہ آپ تین دن تین رات سے محاذ پر ہیں۔ آرام کے واسطے ذرا بھر کے لیے پیچھے آ جائیں آپ کی جگہ دوسرا آدمی بھیج دیتے ہیں۔ میجر عزیز نے جواب دیا۔ بڑا نازک محاذ اور خطرناک مرحلہ ہے۔ میں دشمن کی ہر چال کو سمجھ چکا ہوں۔ میں واپس آنے کے لیے میدان جنگ میں نہیں آیا۔ کسی کو نہ بھیجیں۔ میرا آرام اسی میں ہے سارا دن اور ساری رات اسی طرح بھوکے پیاسے محاذ کے مختلف پہلوؤں پر بھاگتے ، دوڑتے اور دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لئے فائر کرواتے رہے۔ رات گذر گئی۔ اگلا دن چڑھا ، کھانے کا وقت آیا۔ اردلی سے ایک پوری شرق سے لے کر پوچھا کیا سب جوانوں کو پوریاں مل گئیں۔ جواب نفی میں ملا تو فوراً وہ پوری لوٹا دی اور کہا کہ کسی جوان کو دے دو۔ میرے پاس کل والی چپاتی ابھی موجود ہے۔ ۹ ستمبر تک برکی کا محاذ اور یہ چوبارہ دشمن کے دل و دماغ پہ بری طرح چھایا ہوا تھا۔ وہ ہر قیمت پہ اس چوکی

کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ بار بار ہوائی حملے کیے
بم پھینکے مگر ناکام رہے۔ آج بھی میجر عزیز نے
کمال دانش مندی اور فوجی بصیرت کا ثبوت دیتے
ہوئے عین درختوں کے اس جھنڈ پر گولہ باری کرائی،
جہاں دشمن نے ساری رات اسلحہ اور بارود جمع کیا تھا۔
آج دشمن کا بیحد نقصان ہوا۔ آج ایک گولہ بالآخر
بالا خانہ کے ایک حصے کو آ ہی لگا۔ مگر آپ کو
خدا نے محفوظ رکھا۔ اب بے حد احتیاط کی ضرورت
تھی۔ نشانہ بالکل درست آ رہا تھا۔ شام ہوئی۔ دشمن
کی نقل و حرکت کے آثار نہ پا کر بہت حیران ہوئے۔
پندرہ منٹ کے لئے آنکھ لگی۔ پھر چونک کر اٹھے اور
پوچھا کیا میرے کان بج رہے ہیں یا واقعی دشمن کے
ٹینک آ رہے ہیں۔ ان کا شک درست نکلا۔ فوراً
فائرنگ کروا کے ان کا کام تمام کیا۔ ۱۰ ستمبر کی صبح
تک دشمن کی طرف سے ایک پُر اسرار خاموشی تھی۔ کہنے
لگے یہ کسی بڑے حملے کا پیش خیمہ ہے۔ دور جھاڑیوں
میں گھسر پھسر اور ہلچل دیکھ کر جو فائرنگ کروائی

تو دشمن کی رات بھر کی زبردست تیاری کو ختم
کر کے رکھ دیا۔ اس دن پاک فوج کے دوسرے
افسروں نے بھی آپ سے مل کر جنگی تفصیلات دریافت
کیں۔ تو وہ حیران رہ گئے۔ کہ ایک مختصر سی جماعت
کے ساتھ اس نازک ترین محاذ پہ تاریخ پاکستان
کا ایک اہم ترین باب لکھ رہے تھے۔ ۱۲۰ گھنٹے گزر
چکے ہیں۔ وہ فقط اپنے دفاع ہی پہ مطمئن نہیں
بلکہ خود جوابی حملے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے۔ پچھلا
پُل ۶ر ستمبر ہی سے توڑ دیا گیا تھا۔ خطرے کے وقت
گولہ بارود ان تک پہنچانا بھی مشکل ہو جاتا اور شکست
کی صورت میں تو دشمن انھیں نہر عبور کرنے کی مہلت
بھی نہ دیتا مگر وہ جذبہ ایمان سے سرشار سپاہی ہر
خطرے سے بے نیاز تھے۔ اگلے روز حالات قابو سے
باہر ہو رہے تھے۔ دشمن کی فوج لحظہ بہ لحظہ سیلابی
شکل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ گھمسان کا رن پڑا۔
قیامت کا سماں تھا۔ بھارتی ٹینک کمانڈر کرنل جوشی
اسی گولہ باری میں ہلاک ہوا۔ آج میجر عزیز بھٹی اور
ان کے ساتھی بھی گھیرے میں آ گئے مگر اگلے ہی

ملبے دشمن کی چار لاشیں تڑپ رہی تھیں - باقی بھاگ گئے - پیچھے ہٹ کر اپنے جوانوں کو للکارا کہ آخری گولی اور آخری آدمی تک لڑنا - انشا اللہ فتح ہوگی - ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ ہر سُو موت ہی موت منڈلا رہی تھی - زمین و آسمان آگ اگل رہے تھے - دشمن کا یہ حملہ بھی ناکام کر دیا اور آخر دشمن کی پیش قدمی کا خطرہ گھٹنے لگا -

اگلے روز میجر عزیز اپنے کمانڈنگ افسر کے بلانے پر پیچھے ہیڈ کوارٹر پہ گئے - لگاتار ۱۴۰ گھنٹے برکی کے انتہائی نازک محاذ پہ تاریخی کردار ادا کرتے والا یہ شیر دل مجاہد ،پوری فوجی مستعدی کے ساتھ جیپ سے اترا - افسرانِ بالا نے گلے لگایا - میجر عزیز بھٹی کی حیرت انگیز مستعدی ان کے چہرے کے تاثرات اور لالہ کے پھول کی مانند سرخ آنکھیں اور ان میں نرگسی ڈورے، ان سب باتوں میں ان کی بے خواب راتوں ، بیتاب ولولہ انگیزیوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی سینکڑوں داستانیں پوشیدہ تھیں - باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کام خاص کوئی نہیں -

اس تاریخی جنگ لڑنے پر مبارک باد کے لیے بلایا گیا ہے ۔ اتنے کم نوجوانوں کے ساتھ اتنی بڑی تاریخی جنگ لڑنے پر ہر طرف سے مبارک باد کے ڈونگرے برس گئے ۔ آپ نے لاہور کے مقدس شہر سے دشمن کے ناپاک قدم دور رکھے ۔ سب نے کہا آپ اپنا کام کر چکے ہیں ۔ آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے ۔ اب آپ پیچھے ہی رہیں ۔ آپ نے جواب دیا میں آپ کے جذبات کا بیحد شکر گزار ہوں ۔ لیکن یقین کریں ۔ میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا ۔ میرے لیے اصل آرام اور راحت محاذ جنگ پر ہے ۔ یہاں رہنے میں جسمانی آرام ہو گا مگر روحانی کوفت اس سے کہیں بڑھ کر زیادہ ہو گی ۔ جوان محاذ پر ہوں اور میں یہاں آرام میں ، یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ صرف لاہور کے تحفظ کا سوال نہیں ۔ یہ پاکستان بلکہ عالم اسلام کے حصار کے تحفظ کا سوال ہے ۔ میں پچھلے مورچوں میں جانے کی بجائے اگلے مورچوں پہ شہادت کا جام پینے کو عین سعادت اور فخر سمجھوں گا ۔ ان جذبات کے اظہار کے بعد اب انھیں کون روکے ؟ اور کیوں روکے ۔

وہ اٹھے اور سیدھے اپنے جوانوں کے پاس پہنچ کر ان کے شانہ بشانہ مصروف جنگ ہو گئے۔

(۱۲ ستمبر۔ آخری دن) آخر ۱۲ ستمبر کا تاریخی دن چڑھا۔ گزشتہ دنوں کے تلخ تجربے اور شدید نقصانات سے دشمن ذہنی طور پر شکست کھا چکا تھا۔ اب پیش قدمی کا اس میں یارا ہی نہ تھا۔ میجر عزیز نے نہر کی پٹڑی پر کھڑے ہو کر دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا۔ شہادت کی باتیں چھڑ گئیں، مسکرا کر کہنے لگے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ساعت سعید بالکل قریب آ رہی ہے۔ کسے خبر تھی کہ فی الواقع یہ ان کی زندگی کا آخری سورج تھا جو طلوع ہوا تھا۔ ارد گرد گولے آنے لگے۔ ایک نے کہا: جناب فائر آ رہا ہے۔ نیچے آ جائیں۔ جواب دیا میاں نیچے کھڑے ہو کر دشمن کی نقل ■ حرکت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک گولہ ان کے قریب ہی آ کر گرا۔ ساتھیوں نے سمجھا کہ بس زخمی ہو گئے۔ مگر وہ مسکرا کر کہہ رہے تھے "فکر نہ کرو، میں زندہ ہوں

وہ گولہ ابھی بھارت کے کسی کارخانے میں بنا ہی نہیں" لیکن تقدیر میجر عزیز بھٹی کے اس جملے پر مسکرا رہی تھی ۔ وہ گولہ آ رہا تھا ۔ کوئی دس بجے کا عمل تھا دور بین لگانے کو تھے کہ ایک فولادی گولہ ان کے دائیں شانے پر لگا ۔ اور دائیں پھیپھڑے کو چیر کر رکھ گیا ۔ اللہ کا وہ سپاہی ، وہ مرد مومن پاکستان کی حرمت پہ کٹ مرنے والا وہ غازی اوندھے منہ زمین پر گرا ۔ جوان دوڑ کر پہنچے مگر اب کس سے پوچھیں ۔ وہ فرض شناسی جری ، بہادر ، شجاعت کا مجسمہ قربانی کا پیکر ، شہادت کا متوالا ، نیند کا ماتا اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو چکا تھا ۔ لاہور پر حملے کا خطرہ ٹل چکا تھا اور دور آسمان کی نورانی بستیوں میں افق کے اس پار میجر عزیز بھٹی شہید کی روح رسول اللہ کے جھنڈے تلے کتنی ابدی راحتوں سے ہمکنار تھی ، شہید کے علاوہ کوئی کیا جانے ؟

؎ کس نداند جز شہید این نکتہ را
کو بجانِ خود خرید این نکتہ را

راشد منہاس

(ایک نوعمر، نوخیز اور نوآموز لڑکے کی لامثالی جرأت)

۲۰ر اگست ۱۹۷۱ء دن کے گیارہ بجے پاکستانی فضائیہ کا ایک طیارہ پرواز کے لیئے تیار کھڑا تھا جس میں بیس سالہ نوجوان پائیلٹ راشد منہاس ایک گھنٹہ بیس منٹ کی تربیتی پرواز پر جانے والا تھا۔تربیتی پرواز کا طویل آزمائشی اور کٹھن مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ نوجوان ایک مرتبہ تن تنہا پرواز کر بھی چکا تھا۔ آج دوسری تنہا آزمائشی پرواز کا دن تھا۔ گیارہ بجکر چھبیس منٹ پر یہ نوجوان اپنے طیارے کو ہینگر سے نکال کر رن وے کے ایک کونے پر لے آیا تھا۔ کنٹرول ٹاور نے پرواز کی اجازت دے دی تھی۔

اچانک راشد کے طیارے کے نزدیک ایک اوپل کار

آ کر رُکی۔ اس کار میں راشد کا انسٹرکٹر مطیع الرحمٰن سوار تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور کچھ کہا مگر انجن کے شور سے تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ راشد منہاس استاد کے ادب سے رُک گیا کاک پٹ کا دروازہ کھولا۔ منہ سے گیس ماسک ہٹایا اور بات سننے کے لیے نیچے جھکا ہی تھا کہ مطیع الرحمٰن نے تیزی سے لپک کر راشد کے منہ پر کلوروفارم والا رومال رکھا۔ اسے اندر دھکیل کر پھٹ سے دروازہ بند کیا اور لپک کر کاک پٹ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا گویا دوہرے کنٹرول والے اس طیارے کا ایک یونٹ اب اس کے قبضہ میں تھا۔ ادھر راشد منہاس نے نیم بے ہوش اور بے جان اپنی سیٹ پر دراز ذرا سنبھلنے کی کوشش کی اور تین منٹ کے اندر اندر کنٹرول ٹاور کو خطرے کا سگنل دیا اور پکار کر کہا کہ ایک غدّار افسر مجھے طاقت کے ذریعے اغوا کر کے بھارت لے جانا چاہتا ہے۔ اس پیغام کے ملتے ہی طیارے نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کنٹرول

نے ہر چند کوشش کی اور پانچ مرتبہ طیارے کو رکنے
کی ہدایت کی لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا اور
طیارے نے پرواز شروع کر دی - اس کا رُخ مشرق
کی طرف تھا - کنٹرول نے راشد منہاس کو طیارے کو
کنٹرول ہاتھ میں لینے کی ہدایت کی ، جس کے ساتھ
ہی پاک فضائیہ کے طیارے بھی حرکت میں آ گئے اور
اس طیارے کی تلاش میں پرواز کرنے لگے اس کے
دو منٹ کے بعد راشد کی آواز ایک مرتبہ پھر
ابھری کہ میں طیارہ اغوا نہیں ہونے دوں گا ۔ اور
اس کے بعد کنٹرول ٹاور سے طیارے کا رابطہ
ٹوٹ گیا -

مطیع الرحمٰن ایک ماہر پائلٹ تھا ۔ اس لیے بڑی
آسانی سے اس نے طیارے کو تیس چالیس فٹ کی
بلندی پر اڑایا اور پھر پاک فضائیہ کے طیاروں اور
راڈار کی زد سے بچنے کے لیئے انتہائی نیچے پرواز جاری
رکھی اور طیارے کا رُخ بھارتی ہوائی اڈے جودھپور
کی طرف پھیر دیا - اب طیارے کا کنٹرول حاصل کرنے

کے لیے دونوں میں کش مکش ہوئی کیونکہ آخری بار جب راشد نے کنٹرول سے بات کی تو اس کی آواز بڑی بلند تھی جیسے وہ کسی کش مکش اور جذباتی ہیجان میں ہو اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہو۔ وہ چیخ کر اور گرج کر بولا۔ "میں طیارے کو اغوا نہیں ہونے دوں گا۔" راشد کی پوری کوشش تھی کہ طیارے کو اونچا لے جائے۔ اس کا خیال تھا کہ بلندی پہ جا کر ہلمٹ اور آکسیجن کے بغیر یہ آدمی زندہ نہیں رہ سکے گا اور اپنی موت آپ مر جائے گا۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ طیارے کا رخ موڑا بھی، مگر غدار نے جلدی ہی کنٹرول پھر اس سے چھین لیا۔ وہ ایک تجربہ کار پائلٹ تھا اور انتہائی ماہر ہوا باز۔ ایک نو عمر اور نوخیز نوجوان کی اپنے استاد کے سامنے کچھ پیش نہ چل سکتی تھی۔ اب بلندی کا خیال چھوڑ کر راشد نے اپنے جی میں کچھ اور ہی ٹھان لی۔ ان چند لمحات میں اس ناتجربہ کار

نوجوان نے جو کرنا تھا اس کا فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ طیارہ دشمن کی سر زمین پہ نہیں جائے گا۔

ادھر جودھپور کے ہوائی اڈے کے حکام کو پتہ تھا کہ ایک پاکستانی طیارہ اغوا کر کے لایا جا رہا ہے۔ اس کے آنے کے سب بندوبست بھی ہو چکے تھے۔ بھارتی حکومت ان لمحوں کے انتظار میں تھی جب وہ ایک سنسنی خیز خبر سنے۔ ادھر سب کی آنکھیں فضا میں لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں ہمارا ہیرو اور ہمارا وہ مال غنیمت کب ہاتھ آتا ہے۔

مگر راشد تو زندگی اور موت، بزدلی اور بہادری میں سے ایک کا انتخاب کر چکا تھا۔ اسے زندہ رہنے کی آرزو بھی اور وہ زندہ رہنا جانتا تھا۔ اقبال کا یہ شاہین خوب جانتا تھا کہ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں کبھی مر کر بھی زندگی ملتی ہے

ع ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

راشد منہاس نے کم بلندی پہ پرواز کرنے والے غدار کا علاج یہی سوچا کہ کیوں نہ اسے زمین سے

ٹکرا دوں اور یہ بات نسبتاً آسان بھی تھی ۔ دو تین دفعہ کوشش کی مگر مطیع الرحمٰن نے ہر مرتبہ اپنی فنی مہارت کی بدولت طیارے کو گرنے سے بچا لیا لیکن تیسری مرتبہ راشد نے للکار کر کہا کہ تمھارا یہ ناپاک ارادہ کبھی پورا نہیں ہو گا۔ اب بھارتی سرحد عبور کرنے میں محض دو ڈھائی منٹ کا وقفہ تھا ۔ پاک فضائیہ کے دامن اور ارض پاکستان کی حرمت پہ ایک بد نما داغ لگ جاتا ۔

راشد نے تیسری مرتبہ ایک بھر پور کوشش کر کے طیارے کا رُخ زمین کی طرف موڑ دیا، اب کے استاد بھی نہ سنبھل سکا ۔ اب کے مقابلہ استاد اور شاگرد میں نہ تھا ۔ اب مقابلہ عشق اور غداری کے درمیان تھا ۔ طیارہ زمین سے ٹکرایا ۔ ایک گونج اٹھی اور فضا کی وسعتوں میں گم ہو گئی ۔ پاک فضائیہ کے طیارے تین گھنٹے تک گم شدہ طیارے کی تلاش کرتے رہے اور ناکام واپس لوٹے ۔ یہ حادثہ کراچی سے کوئی ساٹھ میل دور مغرب کی جانب شاہ بندر

آٹھ میل دور پیش آیا۔ موضع جنڈ کے دیہاتیوں نے یہ سارا سانحہ آنکھوں سے دیکھا اور اس جگہ کا نام عقیدت کے مارے شہید ڈارو یعنی مقام شہید رکھ دیا۔ ادھر طیارے ناکام لوٹے اور ادھر ٹھٹھہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اطلاع دی کہ ایک طیارہ موضع جنڈ کے قریب گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ فضائیہ کے ہیلی کوپٹر موقع واردات پر پہنچے تو اٹھتے ہوئے دھوئیں کے سوا وہاں تھا ہی کیا۔ طیارے کے آلات نے بتایا کہ یہ حادثہ گیارہ بج کر انتالیس منٹ پر پیش آیا اور طیارہ اس سے قبل دو مرتبہ انتہائی نیچے آ کر پھر بلند ہوا تھا۔

اس ساری کش مکش کے دوران جو تیرہ منٹ تک رہی مطیع الرحمٰن نے وائرلیس پر صرف ایک پیغام دیا تھا کہ وہ جودھ پور جا رہا ہے اور اس کے ساتھی اس کے بیوی بچوں کو لے کر بھارتی ہائی کمیشن میں پناہ لے لیں۔ لیکن نہ تو وہ جودھ پور پہنچ سکا اور نہ ہی اس کے بیوی بچے اور ساتھی پناہ لے سکے۔

البتہ راشد منہاس کی وہ خواہش ضرور پوری ہو گئی جو اس نے اپنی ڈائری میں لکھی ہوئی تھی :

"دنیا ایک سرائے ہے اور زندگی کا وقفہ مختصر ہے کیوں نہ ہم وقت کو زیر کر لیں اور کوئی ایسا کارنامہ انجام دیں کہ آنے والی نسلیں ہمیں عظیم انسان کے نام سے یاد کریں"

وہ حیات جاوداں پا گیا، غدار مٹ گیا۔ راشد جیت گیا اور موت ہار گئی۔ ہم سب کی گردنیں ادب و احترام کے مارے اس نوجوان کے سامنے خم ہیں۔

طفیل شہید، سرور شہید اور عزیز بھٹی شہید کے بعد راشد منہاس پاکستان کی عظمت و برتری کے وہ بلند اور روشن مینار ہیں جن کے بہادرانہ کارناموں سے روشنی کے سوتے پھوٹتے رہیں گے۔ روشنی کے یہ بلند مینار زندگی کی تیرہ و تاریک ساعتوں میں پاکستان کی آنے والی نسلوں کے لیئے مشعل راہ کا کام دیں گے اور نوجوانوں کو ملک و ملت کی خاطر بے دریغ جان کی قربانی دینے کی دعوت دیتے رہیں گے۔

یہ ہماری ملت اسلامیہ کے عظیم اور فلک بوس مینار ہیں۔ ان میں سے ہر کسی نے اپنا فرض بہتر سے بہتر طریق پر سر انجام دیا اور اپنے پیچھے ایسی درخشاں مثالیں چھوڑیں کہ پوری قوم ان کی احسان مند ہے۔ پاکستان کی مختصر سی بیس پچیس سالہ تاریخ میں انھوں نے وہ مقام حاصل کر لیا جو ہر پاکستانی کے لیے فخر و سر بلندی کا باعث ہے۔

راشد منہاس شہید کی تیرہ منٹ کی جدوجہد اور کش مکش جتنی مختصر ہے اتنی ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز بھی ہے۔ وہ بیس سال کا الھڑ نوجوان، اٹھتی جوانی ابھی فنی تربیت کے مرحلے بھی مکمل نہ کر پایا تھا کہ اسے انتہائی نازک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے چند لمحے ملے۔ اسی کش مکش اور گیرو دار میں اسے سب کچھ سوچنا اور فیصلہ کرنا تھا۔ اسی میں کوئی قطعی اقدام اٹھانا تھا۔ اس نے منٹوں، سیکنڈوں میں وہ فیصلہ کر لیا جس سے وہ خود "امر" ہو گیا۔ قوم کے سر بلند ہو گئے۔ موت ہار گئی، وہ جیت گیا۔ اور آج اس کا وہ کارنامہ

ہماری تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے ۔ کل تک وہ اپنے
ماں باپ اور رشتہ داروں کا عزیز تھا ۔ آج وہ کروڑوں
پاکستانیوں کے دل کی گہرائیوں میں بستا ہے ، آج وہ
سب کا قریبی عزیز ہے ۔ بظاہر وہ کسی قبر میں سیکڑوں
من مٹی کے نیچے دفن ہے لیکن دراصل وہ زندہ جاوید
ہے اور ہر پاکستانی کے دل میں زندگی کی لگن بیدار
کر رہا ہے اور اسے ملک و ملت کے لئے جانفشانی
کا سبق دے رہا ہے ؂

تاریخِ اسلام کے

چند زرّیں واقعات

مصنف

ڈاکٹر عبداللطیف

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور